اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اُفقِ خاور

اُفق خاور اسی شعلہ نوائی کا تسلسل ہے

خاور سلہری

اُفقِ خاور

اُٹھ کہ ظُلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نمائی سے اُجالا کر دیں

اُفقِ خاور

اُفقِ خاور اسی شعلہ نوائی کا تسلسل ہے
مذہب، سیاست، معاشرت، تعلیم، تصوف اور سماجیات پر نمائندہ کالمز اور مضامین کا انتخاب

خاور سلہری

ਸੁਲੇਖ
سُلیکھ

اُفقِ خاور...... کالم...... خاور سلہری

عبداللہ جی نے بلال اُسامہ پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کے
سُلیکھ، مدینہ ٹاور، فیروزپور روڈ، لاہور، سے شائع کی۔

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اشاعت اول	:	2026ء
ٹائٹل	:	خاور سلہری
کمپوزنگ	:	محمد زبیر
تعداد	:	1000
قیمت	:	1500روپے
رابطہ مصنف	:	agas75@gmail.com

Ufq-e-Kawar
(An Urdu Columns book by Khawar Sulehri)

Copyright @ 2026 - 1st Edition.

Printed by:
Usama Bilal Printers, Lahore.

Price: Rs. 1500.00

ISBN: 978-969-7863-61-7

Sulaikh
bookmakers
printing.publishing.editing
P- 67 2nd Floor Madina Tower,224 Ferozpur Road, Lahore.
+ 92 300 44 30 626 sulaikh.books@gmail.com

انتساب

تین عورتیں تین کہانیاں
جنہوں نے مجھے محبت، پیار اور وقت دیا......
برداشت کیا......

امی جی	:	جن کا متبادل نہیں
نِصف بہتر	:	جس کا ایثار اور برداشت مثالی ہے
دُختر	:	ماہین خاور چودھری، محبت اور زندگی کی علامت

فہرست

❖ عرضِ ناشر		13
❖ اُفقِ خاور پر شعلہ نوائی	سید انجم محمود گیلانی	15
❖ اُفقِ خاور	محبوب صابر	19
❖ صحافی سچ بولتا ہے	نصیر احمد نصیر	21
❖ اُفقِ خاور	اروِند گُپتا	23
❖ خاور اور اُفقِ خاور	جنگ بہادر گوئل	24
❖ اُف! کہ خاور سے "اُفقِ خاور" تک	محمد زبیر	25
❖ اظہارِ تشکر	خاور سلہری	27

سیرتِ محسنِ کائنات کا ایک ورق۔۔۔	31
بندہ صحرائی لباسِ جدید میں۔۔۔!	35
نسخہ کیمیا	39
یادِ رفتگان	41
اپنی کھڑکیاں صاف رکھیں	45
خود کو تبدیل کریں اپنے لیے اپنے بچوں کے لیے	47

طرزِ فکر، خوشی اور ہم	48
رسمی تعلیم ہر ایک کے لیے نہیں	51
اشتہا انگیز اشتہارات	53
کون سکھائے گا؟	56
ہماری علمی قابلیت	59
۱۱۵۰ دن کی تاخیر سے دیا گیا پُرسہ	62
امریکی دھمکی، سپریم کورٹ فیصلہ اور رجیم چینج	66
بچوں کا کیا قصور؟؟؟	70
اولاد ایک مشن	73
1965 کی جنگ اور سیالکوٹ	75
تُوں تُوں میں میں	78
ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔۔۔!	80
کتے بلوں کو ہانڈی نہ سونگھنے دیں!	83
توبہ	86
اللہ کی محبت	90
ووٹ کیوں اور کس کے لیے؟	92
ہیپی ویلنٹائن دے یا یوم حیا	95
میرا شہر سیالکوٹ	99
”شہادتِ نہج البلاغ“	103

قادیانیت کا مقابلہ	108
بھلے نہ چھوڑیئے مگر چھیڑیئے بھی نا	110
ان کی درجن ۱۳ کی ہے	112
ذہنی پولیو	114
بچے اور ہم	118
ڈاکٹر عفت شہاب	123
روحانی تکیہ	125
سورۃ الرحمٰن کا اعجاز اور پیر صفدر شاہ بخاریؒ	126
تاریخی ریکارڈ تو درست رکھیں!!!	129
مگر ہم نہیں سیکھتے	131
زیادہ اولاد پیدا کرنے والی!	133
شہادتِ حسین توہینِ رسالت ہے	134
عورت اک معمہ ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا	142
نفاذِ اُردو کے داعیان کے نام!	148
سفر پر نکلو	150
وائٹ ہاؤس میں فری لنچ	152
804 صرف تاریخ رقم کرے گا ورنہ۔۔۔!	155
فروغ تعلیم میں نجی اداروں کا ناگزیر کردار	157
ہم زاد	159

باپ۔۔۔	161
چلی ہے رسم کوئی نہ سر اٹھا کے چلے	163
کیا صرف نصابی تعلیم کافی ہے؟	166
انسانی حرمت اور مولانا طارق جمیل	169
فلسفہء کربلا	170
آسانیاں تقسیم کیجئے	172
پردہ گرتا ہے	175
صحافت کہاں ہے۔۔۔؟	177
محسن اسلام ذوالفقار علی بھٹو	179
روحِ محمد ﷺ	183
دِلیؔ ہَنُوز دُور اَست	185
عاشر عظیم بھی ہجرت کر گیا	188
عہدِ یوسفی تمام ہوا	191
پانی زندگی ہے	193
اب ہی پراکسی بننے سے توبہ کیجئے	195
ہمیں بھی یاد کر لینا جب گُلشن میں بہار آئے	199
بچے مارتے کیوں ہیں؟ کیسے روکا جائے؟	201
پردہ	208
ہماری علم دشمنی	211

فتوے سے گریز ہی تقویٰ ہے	214
لبیک	215
آج اردو کے نامور شاعر ن م راشد کی برسی ہے	218
عمران خان، اقوامِ متحدہ اور حرمتِ رسول ﷺ	220
قصہ ایک نہ سُنے گئے مشاعرے کا	221
کتھا ایک سُنے مشاعرے کی	223
اچھا گمان رکھیئے	224
کشمیر اور دنیا	226
تعطیلات۔۔۔زیاں یا امکان؟	228
جلنے کڑھنے سے اجتناب کریں	231
مختار مسعود	233
حکومت ڈر گئی	235
۔۔۔ورنہ اُمیدِ "خزاں" رکھ	239
مختصر مختصر	243
کوتاہ اندیشی اور علمی انحطاط	253
رُدالیاں	253
اُلجھنے سے بچو	254
مسلم معاشرے اور سیکولرازم	255
میرے محسن	256

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب محض کالمز اور مضامین کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک ایسے ذہن کی فکری روداد ہے جو اپنے عہد کے سوالات سے بھی باخبر ہے اور اپنے باطن کے احتساب سے بھی غافل نہیں۔ مصنف نے اپنے مشاہدات، تجربات اور مطالعے کو نہ کسی دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے اور نہ کسی مسلّمہ سچائی کا جامد اعلان بنایا ہے، بلکہ یہ تحریریں قاری کو سوچنے، ٹھہرنے اور اپنے اردگرد کے سماجی، فکری اور روحانی مناظر پر از سرِ نو نظر ڈالنے کی دعوت دیتی ہیں۔

ان مضامین میں سیاست، مذہب، سماجیات اور علم و فن کے موضوعات ایک ایسے زاویے سے سامنے آتے ہیں جو نہ خطیبانہ ہے اور نہ واعظانہ، بلکہ سوال در سوال، اور معنی در معنی کا سلسلہ ہے۔ مصنف کا اسلوب سادہ، شستہ اور وقار سے آراستہ ہے، جس میں مطالعے کی گہرائی، فکر کی سنجیدگی اور دل کی سچائی یکجا ہو کر قاری سے مکالمہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریریں محض اپنے وقت تک محدود نہیں رہتیں بلکہ آنے والے وقتوں میں بھی اپنی معنویت برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کا مقصد نہ کسی خاص فکر کی تبلیغ ہے اور نہ کسی مخصوص زاویۂ نظر کا نفاذ، بلکہ یہ کوشش ہے کہ سنجیدہ قاری کے ہاتھ میں ایک ایسی کتاب دی جائے جو اس کے ذہن کو متحرک کرے، اس کے سوالوں کو جِلا دے اور اسے یہ احساس دلائے کہ سوچنے کا عمل آج بھی زندہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب اُن

قارئین کے لیے خاص طور پر باعثِ کشش ہو گی جو تحریر میں محض معلومات نہیں بلکہ فکری دیانت، تہذیبی شعور اور باطنی صداقت تلاش کرتے ہیں۔

ناشر کے لیے یہ امر باعثِ مسرت اور باعثِ اعزاز ہے کہ اسے اس کتاب کی اشاعت کا موقع ملا۔ ہم مصنف کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنی تحریروں کو ہمارے اعتماد کے سپرد کیا، اور اُن تمام اہلِ علم کے بھی ممنون ہیں جن کی آرا اور تبصروں نے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔ دعا ہے کہ یہ کتاب اپنے قارئین تک پہنچ کر فکری مکالمے کو فروغ دے اور مطالعے کے ذوق کو تازہ کرے۔

سُلیکھ

☆☆☆

اُفقِ خاور پر شعلہ نوائی

قلم اور قلم کار کی فضیلت و اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ کیوں نہ ہو، قلم کی گواہی خود خالقِ کائنات نے دی ہے، جو اس کی عظمت و رفعت کی ابدی سند ہے۔

انسان کی فکری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ قلم علم و دانش اور انسانی تہذیب کے ارتقاء کا بنیادی وسیلہ ہے۔ یہی قلم تدبر و تفکر کے بند دریچوں کو وا کرتا اور علم و آگہی کے افق کو روشن کرتا ہے۔ دانشوروں، ادیبوں، نقادوں حتیٰ کہ صحافت کے میدان میں سرگرم کالم نگاروں کو بھی قلم ہی نے دوام عطا کیا ہے۔

"قلم" اور "قلم کار" کا رشتہ نہایت گہرا اور پائیدار رہا ہے۔ ابلاغ کے جدید ذرائع میں کالم نویسی ایک مؤثر صنف ہے، جس کے ذریعے قلم کار مختصر مگر جامع تحریر میں گہرے پیغام کو عام کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا قلم "الہلال" میں، اور مولانا ظفر علی خان کا قلم "زمیندار" میں، ملی شعور و آگہی کا بہترین ذریعہ بنا۔

اسی روایت نے ہمارے حساس اور دردمند دل رکھنے والے اہلِ قلم کے قلوب و اذہان پر گہرے نقوش چھوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مصلحانہ فکر کے حامل قلم کار اپنی ثقافتی شناخت، مذہبی تعلیمات، اخلاقی اقدار اور فکری روایات کے امین بن کر قلم کاری کو فروغِ دانش کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ کالم نگاری اسی فریضے کی ادائیگی کا حسین و مؤثر اسلوب ہے۔

اسی تناظر میں "فکرِ رفیق" سے منور دل رکھنے والے ممتاز اور متحرک قلم کار، سوشل میڈیا ایکٹیوسٹ برادرم "چوہدری خاور سلہری" کا نام اور کام کئی حوالوں سے منفرد اور لائقِ تحسین ہے۔

سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم پر ان کی ہمہ جہت علمی و ادبی خدمات اور فکری تحریک نے انہیں آسمانِ فکر و علم کا ایک درخشاں ستارہ بنا دیا ہے۔ ان کا کردار ایک فرد سے بڑھ کر ایک انجمن کا سا ہے۔

"جناب چوہدری خاور سلہری صاحب" مختلف قومی اخبارات میں اپنا کالم "اُفقِ خاور" کے عنوان سے لکھتے ہیں، اس لیے یہی عنوان ان کے منتخب کالموں کے اس مجموعے کی پیشانی بنا ہے۔

کتاب کا نام بھی معنی خیز ہے۔ اسے علامہ اقبال کی فکر کے محورِ مشرق کے تناظر میں "مشرق کا اُفق" کہا جا سکتا ہے۔

مایوسیوں اور زوال کے شور میں "چوہدری خاور سلہری صاحب" نے بڑی چابکدستی سے اُمید کی شمع جلائی ہے۔ "اُفقِ خاور" سے مراد وہ مقام ہے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے یعنی روشنی، بیداری اور آغازِ نو کی علامت۔

یہ دراصل اقبال کی اسی جدلیاتی فکر کا استعارہ ہے، جس کی جھلک بانگِ درا کے ان اشعار میں نمایاں ہے:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

"خاور سلہری" کے کالم ان کے مشاہدے، تجزیے اور فکر کی زندہ تصویریں ہیں۔ وہ معاشرتی حقائق کو الفاظ کا پیکر عطا کرتے ہیں، اور ان کے مضامین محض لفظوں کی جگالی نہیں بلکہ غور و فکر اور تجربے کی شعوری پیداوار ہیں۔

ان کے کالم معاشرے کا آئینہ ہیں۔ ایک ایسا آئینہ جو زنگ آلود نہیں بلکہ شفاف ہے۔ ان کا تدبر، تجزیاتی بصیرت، اعتدال، اور شائستگی پیشہ ورانہ کالم نگاری کے حسین اوصاف ہیں۔

"اُفقِ خاور" کا قلم کار فکری پس منظر، تعلیمی مہارت، اجتماعی شعور، تحقیقی گہرائی، اور اخلاقی وقار سے مزین ہے۔ یہی اوصاف کسی بھی مؤثر کالم نگار کے لیے لازم ہیں۔

''چوہدری خاور سلہری'' جیسے روشن ضمیر اہلِ قلم ہی نے ہر دور میں سماج کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔

ان کے کالم پڑھتے جایئے، تو احساس پختہ ہوتا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے خام مواد سے ایک ایسی دنیا تخلیق کرتے ہیں جہاں معنی، تجربہ اور اقدار ایک نئی روح پاتے ہیں۔

''اُفقِ خاور'' کی یہ تحریری لہریں اس بات کی دلیل ہیں کہ جب قلم ضمیر کی روشنائی سے لکھتا ہے تو لفظ مقدس ہو جاتے ہیں۔

حرمتِ قلم و قرطاس ہی لفظوں کو وقعت بخشتی ہے، اور دانائی وہ چراغ ہے جو کالم کے راستے قلوب میں اجالا کرتا ہے۔

بلاشبہ یہ کالمی سفر ایک ماہرِ تعلیم، دردمند دل رکھنے والے استاد، اور روشن خیال قلم کار ''خاور سلہری'' کی فکری میراث ہے۔

سلہری صاحب مردِ حُر ہیں۔ وہ جو زندگی کو صرف گزارتے نہیں، جیتے ہیں۔ وہ دل سے سوچتے ہیں، دل سے محسوس کرتے ہیں، اور دل ہی سے زندگی کو برتتے ہیں۔

دل اور دماغ کی کشمکش انسانی فطرت کا ابدی موضوع ہے، مگر ''سلہری صاحب'' کے ہاں یہ کشمکش ایک لطیف مکالمے کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

وہ نہ محض عقلی ہیں، نہ صرف جذباتی، بلکہ ان کے ہاں تصوف اور حقیقت کا نازک توازن قائم ہے، جیسے کوئی قلندر معرفت کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔

وہ سچ کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں، اور اب اپنے سچ پر قائم ہیں۔

سچائی کے مسافر کو جاننا چاہیے کہ سچ کسی کے ساتھ نہیں ہوتا، نیلسن مینڈیلا کے ساتھ بھی نہیں۔ البتہ انسان سچ کے قریب تر رہنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

''سلہری صاحب'' کی شخصیت کسی ایک تعریف میں قید نہیں ہو سکتی۔

آپ ''خوش'' کے ساتھ جتنے لاحقے چاہیں جوڑ لیں خوش وقت، خوش مزاج، خوش لباس، خوش قرطاس، خوش خیال، خوش اطوار مگر ان کے وجود کا احاطہ ممکن نہیں۔

''سلہری صاحب'' ایک زندہ تجربہ ہیں اور ان کا تذکرہ دراصل اس تہذیبی جمالیات کا بیان ہے جو ہمارے معاشرے سے بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔

تحسین و مبارک باد ہر صاحبِ کتاب کا حق اور اہلِ علم و ادب کا فریضہ ہے۔

میں ”جناب خاور سلہری“ کو اس خوب صورت مجموعۂ کالم کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

”اُفقِ خاور“ کی دیدہ زیب اشاعت نہ صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ کتابی دنیا میں ایک قابلِ قدر اضافہ بھی ہے۔

”سلہری صاحب“ نے جس ہنر مندی اور چابک دستی سے اپنی ”ہڈ بیتی“ کو ”جگ بیتی“ کا روپ دیا ہے، یہ انہی کی شخصیت کا خاصہ ہے۔

یہ کالموں کا مجموعہ اُن کے تخلیقی سفر کے حاصلات کا ایک فطری اظہار ہے، جس میں نہ تصنع ہے نہ بناوٹ ۔

بلکہ اقبال کے الفاظ میں:

ہر چہ در دل گُذرد وقفِ زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

یہ شمع سوزِ دروں کی گواہ ہے اور ”خاور سلہری“ اس روشنی کے امین۔

سید انجم محمود گیلانی

☆☆☆

اُفقِ خاور

ربع صدی پہلے جب میں سیالکوٹ میں آیا تو میرے چند پہلے شناساؤں میں ایک نام ''چوہدری خاور سلہری'' کا بھی ہے۔ دُبلا پتلا، قدرے کمزور، سانولا سلونا ایک دلکش اور مُتاثر کُن نوجوان، جس میں کشش کا سب سے بڑا سبب اُس کی خُوش لباسی تھی۔ عین لڑکپن میں تھری پیس سوٹ اور ٹائی باندھے ہوئے اُس عمر میں اگرچہ وہ کچھ زیادہ بھلا معلوم نہیں ہوتا تھا مگر جب وہ کسی موضوع پر لب کُشائی کرتا تو اُس مدبرانہ اور عالمانہ انداز وقت کو ساکت کر دیتا۔ سامع اُس کے اعتماد اوعلمی وفور کے سامنے نہ صرف خود کو بے بس محسوس کرنے لگتا بلکہ انتہائی انہماک اور دلچسپی سے اُس کے الفاظ، خیالات اور نظریات کی رعنائی میں کھو جاتا۔ ''خاور''،علمی اور عملی اعتبار سے اُن چند دیانت دار لوگوں میں سے ہے جو لفظ کی حرمت، تقدیس اور رویوں کی لطافت و دِلرُبائی کے ہُنر سے بخوبی واقف ہیں۔ اُس کی ذات جہاں دیگر اوصاف سے مزّین ہے وہاں وہ اظہار کے ایسے وصف سے مُتصف ہے جس میں ابلاغ اور ترسیل کی ہر جہت بہت نُمایاں ہے۔ وہ جس کسی موضوع پر بھی خامہ سرائی کرتا ہے تو استدلال اور تسلسل کو یوں ملحوظ رکھتا ہے جیسے قاری کا ہاتھ تھامے اُسے اپنے خیالات کی مجسّم دنیا میں گھما رہا ہو۔ اُس کے ہاں لفظ سے شناسائی اور اُس کے استعمال کی فطری صلاحیت موجود ہے۔

ہم جو لکھنے لکھانے والے لوگ ہوتے ہیں انہیں کسی کتاب پر اگر کوئی تبصرہ یا رائے لکھنے کے لیے کہا جائے تو ہم عجیب طرح کے احساسِ تفاخر اور خبطِ شہرت میں سرمست اسے اپنے لیے بہت اعزاز تصور کرتے ہیں اور بصد خوشی اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر جب خاور نے مجھے ''اُفقِ خاور'' پر کچھ لکھنے کو کہا تو میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ میری دِلی خواہش تھی

کہ اِس کڑے امتحان سے نہ گُزروں اور کسی نہ کسی طرح اس نہایت باصلاحیت اور شعوری و فِکری اعتبار سے ارفع شخص کے بارے میں اپنے الفاظ کو بچالوں کہ مُجھ جیسے کج فہم اور کم علم شخص کے الفاظ شاید ”خاور“ کی فنی وفکری جہات کا مکمل احاطہ نہ کر سکیں۔ مجھے اپنے دامان کی تنگی کا اعتراف ہے۔ مگر اکلیمِ عشق بھی عجب ہے کہ نہ جہاں فہم کی فصیل، نہ علم کی راہداری اور نہ عقل کا دروازہ ہوتا ہے۔ بس یہ محبت کا ایک لامتناہی حصار ہے جس میں صِرف وجدان کی رہنمائی ہوتی ہے۔ سو اپنی پُوری دیانت و دانشمندی سے جو محسوس کیا سپُردِ قرطاس کر دیا۔

بظاہر تو یہ کالمز کی کتاب ہے مگر اس میں ”خاور“ کا ادیبانہ اسلوب اور اس کی فقرہ سازی، نثر میں اُس کی فنی پختگی اور حرف شناسی کا بیّن ثبوت ہے۔ میں اس کتاب کو صحافتی حلقوں میں تعلیم و تدریس کا ایک مؤثر ترین اضافہ تصور کرتا ہوں۔ ”اُفقِ خاور“ کی شہرت و پذیرائی کی دُعا کے ساتھ ساتھ میں خاور کو ایک مشورہ بھی دینا چاہوں گا کہ اُس میں ایک عمدہ ادیب اور مرصع نثر نگار کے سبھی اوصاف موجود ہیں تو ایک افسانے کی کتاب بھی اُس کے قلم کی کوکھ سے ظہور پذیر ہونی چاہئے۔

13 نومبر 2025
محبوب صابرؔ
سیالکوٹ

☆☆☆

صحافی سچ بولتا ہے

صحافت کے بارے میں اپنا نظریہ میں عنوان کی شکل میں بیان کر چکا ہوں۔ ایک تجربہ اس کے برعکس بھی ملتا ہے، لیکن اس کے اجزائے ترکیبی صحافت کے معیار و تعریف پر پورے نہیں اترتے تو اسے صحافت کہا ہی کیوں جائے؟ ناقدین اسے ''زرد صحافت'' کہا کریں لیکن ہم تو سرے سے اسے صحافت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔

صحافت کا ایک پیرایہ تو ہمیں ''خاور سلہری صاحب'' کے کالمز میں نظر آتا ہے۔ جملے کی کاٹ سے لے کر ''نفس مضمون'' تلک ہر زاویہ صحافت کے معیار پر پورا اترتا دیکھا جا سکتا ہے۔ قارئین کالم کے نفس مضمون سے اختلاف کر سکتے ہیں، اُٹھائے گئے نکتے سے ''سوا'' نظریہ رکھ سکتے ہیں، لیکن کسی جملے پر یہ کہہ کر انگلی نہیں رکھ سکتے کہ کسی صورت حال کا تجزیہ کرنے میں کالم نگار کسی قسم کے دباؤ یا تذبذب کا شکار ہوا ہے۔

''سلہری صاحب'' سے یوں تو ہماری ایک ہی باقاعدہ ملاقات ہے، لیکن ان کے کالمز کے ذریعے ان سے آئے دن ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ایک خاص طرح کا عصری تجربہ، ایک طرح کی منجھی ہوئی سیاسی بصیرت، صورت حال کا تجزیہ کرنے کی بھرپور صلاحیت، تاریخ سے کماحقہ آگاہی، حالاتِ حاضرہ پر گہری تنقیدی نظر، بین السطور ایک طرح کی سنجیدگی ہمارے کالم نگار کے ہاں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

''افق خاور'' جناب خاور سلہری کے منتخب کالمز کا مجموعہ ہے۔ اگر ان کے سبھی کالم ایک جگہ اکٹھے کر دیے جائیں تو یقیناً ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے گا، لیکن جتنا میں خاور سلہری کو جانتا ہوں، وہ مقدار کی بجائے معیار کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک صحافی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک صحافی جس قدر جمہوریت پسند ہوتا ہے اتنا نکتہ نظر قائم کرنے کے میں

جمہوری نہیں ہوتا، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صحافی کے نزدیک "ردّ و قبول" کا حتمی معیار یہ نہیں ہوتا کہ کتنی تعداد میں لوگ اس کے حامی ہیں، بلکہ وہ اپنی ذات میں منطقی ہوتا ہے۔ اسی لیے بڑے صحافی پشین گوئی کرنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ خاور سلہری کوئی صحافت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا شاہین ہے لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کی اڑان بتاتی ہے کہ ایک دن یہ اس بلندی کو چھو لے گا جس کا ہر صحافی خواہشمند ہوا کرتا ہے۔

میں خاور سلہری کو مبارک دیتا ہوں کہ اس نے یہ قیمتی کالمز ایک جگہ اکٹھے کرنے کا اہتمام کیا، اور وہی مشورہ دوں گا جو کبھی کسی خطاط نے نئے خطاط کو دیا تھا!

می نویس و می نویس

نصیر احمد نصیرؔ

اُفقِ خاور

"اُفقِ خاور" ایک ایسے صاحبِ فکر قلم کار کی آواز ہے جو روزمرّہ زندگی کے ہنگاموں میں بھی انسانی قدروں کی حرارت کو محفوظ رکھنا جانتا ہے۔ "چوہدری خاور سلہری" کے یہ کالم کبھی نرم ٹھہرے ہوئے لہجے میں سماجی رویّوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور کبھی نہایت سلیقے سے ہمارے اجتماعی شعور کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ مذہبی معاملات ہوں یا سیاسی نشیب و فراز، طنز کا ہلکا سا پنکھڑی جیسا لمس ہو یا مزاح کی مدھم سی چاشنی مصنف ان سب کو ایک نپی تُلی شائستگی کے ساتھ برتتے ہیں۔

ان کے جملوں میں کسی طرح کی تندی نہیں، بلکہ ایک ایسا خالص انسانی دھارا بہتا محسوس ہوتا ہے جو قاری کے دل کو نرمی سے چھو لیتا ہے۔ ان کا طرزِ بیان نہ تو زور زبردستی کرتا ہے، نہ کسی اخلاقی خطبے کا بوجھ ڈالتا ہے، بس آہستہ سے سوچنے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

"اُفقِ خاور" اُن قارئین کے لیے واقعی ایک خوشگوار تجربہ ہے جو ادبی وقار، ذہنی توازن اور سادہ مگر باوقار زبان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چوہدری خاور سلہری کا قلم ہمیں یاد دلاتا ہے کہ معاشرہ اسی وقت بہتر ہوتا ہے جب لفظ محبت کے ساتھ استعمال ہوں اور فکر تعصّب سے آزاد ہو۔

اروِند گُپتا
پُونے، بھارت

خاور اور اُفقِ خاور

زندگی کی رفتار جتنی تیز ہوتی جارہی ہے، اتنی ہی ضرورت اس بات کی بڑھ گئی ہے کہ کوئی آواز ہمیں ٹھہر کر سوچنے کی دعوت دے۔ ''اُفقِ خاور'' میں چوہدری خاور سلہری کی تحریریں وہی وقفہ، وہی سانس، اور وہی سکون فراہم کرتی ہیں۔ ان کے کالم محض حالات کی روداد نہیں بلکہ ایک ایسے ذہن کی باطنی سفرنامہ نویسی ہیں جو دنیا کو سطحی نگاہ سے نہیں، بلکہ تہوں میں اتر کر دیکھتا ہے۔

خاور سلہری کی نثر میں ایک طرح کی خاموش روشنی ہے، وہ روشنی جو آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی بلکہ دل کے اندر پھیلتی ہے۔ وہ کسی بات کو زور دے کر نہیں کہتے، مگر بات پوری تہذیب کے ساتھ دل میں جگہ بنالیتی ہے۔ ان کی تحریر میں طنز ہے مگر کڑواہٹ نہیں، مزاح ہے مگر بناوٹ نہیں، اور فکر ہے مگر خطابت کا شوروغل نہیں۔

ایک لکھاری کی حیثیت سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کی قوتِ اظہار کا اصل حُسن ''اعتدال'' میں ہے۔ ہر جملہ اپنی جگہ ٹھہرا ہوا، ہر خیال اپنے دائرے میں پورا، اور ہر مشاہدہ اپنی اصل معنویت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ایک طرح سے یہ کالم انسانی تجربات کا ایسا شفاف آئینہ ہیں جس میں قاری خود کو بھی نئے زاویوں سے دیکھنے لگتا ہے۔

''اُفقِ خاور'' اپنے اس طرزِ احساس کے باعث ان لوگوں کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے جو ادب کو محض الفاظ نہیں بلکہ ایک ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب اس بات کی خوبصورت مثال ہے کہ جب قلم اخلاص کے ساتھ چلتا ہے تو وہ دلوں تک رسائی حاصل کرتا ہے، چاہے موضوعات کتنے ہی متنوع کیوں نہ ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ خاور سلہری کی یہ کوشش قارئین کو پسند آئے گی۔

جنگ بہادُر گوئل

چنڈی گڑھ، بھارت

اُف! کہ خاور سے ''اُفقِ خاور'' تک

دنیا خواہ گول ہو، چپٹی ہو یا بیضوی، جیسی بھی ہو!

ایک بات طے ہے کہ یہ اپنی رنگینیوں کے باعث ہمیشہ لطف و سرور کی حامل رہی ہے۔ تاہم اس کا یہ سرور ہر شخص کی طبیعت اور ذوق کے مطابق مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ''کبوتر با کبوتر، باز با باز'' کے مصداق جب کوئی ہم مزاج مل جائے تو یہی دنیا اور زیادہ خوش گوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ سنہ ۲۰۰۲ء کے اواخر میں قدرت نے مجھے ایسا ہی ایک ہم مزاج عطا کیا جس کی رفاقت نے زندگی کے کئی گوشوں میں روشنی کی نئی پرتیں بکھیر دیں۔

''اُفقِ خاور'' سے نمودار ہونے والے اس مہتاب کا نام ''خاور سلہری'' ہے۔ اپنے آبائی سلسلے میں ''خواص پور، تحصیل رام گڑھ، ضلع سامبا، ریاست جموں و کشمیر'' سے تعلق رکھتے ہیں اور حال میں شہرِ اقبال سیالکوٹ کے باسی ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے اتالیق اور ایسے اتالیق کہ جن کی زیرِ سرپرستی اساتذہ اور طلبہ یقیناً ان کی شفقت، محبت اور ترتیبِ حیات کو اپنے لیے کسی گراں بہا ذخیرے سے کم نہ پائیں گے۔

''خاور سلہری''، جنہیں میں پیار اور احترام سے ''خاور بھائی'' کہتا ہوں سے ملاقات تو بعد میں ہوئی، مگر ان کا ایک خط مجھے اس بات پر آمادہ کر گیا کہ ان سے ملنا ناگزیر ہے۔ یہ خط اُنہوں نے اپنے ایک کلائنٹ کے مسئلے کے حل کے لیے ہیڈ آفس کو ارسال کیا تھا۔ مسئلہ تو حل ہو گیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ میرا ''خطِ شکستہ'' بھی گویا ''خطِ مستقیم'' کی جانب گامزن ہو گیا۔

''خاور بھائی'' نہ صرف ایک سنجیدہ قاری اور خوبصورت اسلوب کے مالک نثر نگار ہیں بلکہ نہایت شریف النفس اور ہمدمِ دیرینہ بھی ہیں۔ ان کی رفاقت نے مجھے نہ صرف جہاں

گردی کے مختلف تجربات سے روشناس کرایا بلکہ روحانی شخصیات سے ملاقات کی سعادت بھی بخشی۔ ان اسفار میں کچھ پہلو آوارگی کے بھی شامل تھے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کی "اُمراؤ جان" کی آواز میں یوں کہیے:

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادآ
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

دنیاوی سفر تو ہم اکثر کرتے ہیں، مگر جب ایک سوٹڈ بوٹڈ اور نہایت مہذب شخص آپ کو روحانیت کے سفر کا مسافر بنا لے، تو وہ تجربہ یادگار بھی ہوتا ہے اور قابلِ تحسین بھی۔ "خاور بھائی" کے ساتھ ایسے کئی معنوی سفر نصیب ہوئے جن کی خوشبو آج تک دل میں بسی ہوئی ہے۔

آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب "اُفقِ خاور" اُن کے منتخب کالموں اور فیس بُک تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں مذہبی، سیاسی، اخلاقی، تعلیمی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے، شگفتہ بلکہ کہیں کہیں سخت اور دوٹوک تحریریں بھی شامل ہیں۔ یہ محض کالم نہیں، زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کو اپنی اپنی کیفیات کا عکس یہاں ضرور ملے گا۔ جو بات وہ خود نہ کہہ پائے، وہ "خاور بھائی" نے اپنے قلم سے کہہ دی ہے۔

آخر میں دستِ دعا بلند ہے کہ اللہ ربّ العزت "خاور بھائی" کو ہمیشہ عزت، کامیابی اور سعادت سے نوازے۔ انہیں محبتِ آلِ رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ میں ہمیشہ سرشار رکھے۔ آمین ثم آمین۔

خیر اندیش

محمد زبیر

اظہار تشکر

رب رحمٰن کے نام سے ثنائے رسولِ ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّمہ کے بعد
الحمداللہ رب العالمین الحمداللہ رب رحمت اللعالمین

نیشاپور کے عمرِ خیام کی ایک رباعی ہے جس کے پہلے بند میں وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ اگر تم طالبِ علم ہو (اور یہاں میں طالبِ علم کے بجائے انسان کہنے کی جسارت کر رہا ہوں) تو اہلِ علم کی صحبت اختیار کرو، اور اگر یہ نعمت میسر نہ آئے تو اپنا وقت کتابوں کی رفاقت میں بسر کرو۔

علم، گیان اور ایقان سے آج بھی کوسوں دور ہوں، تاہم کتاب بینی کا ذوق بہت کم عمری میں دل کو لگ گیا تھا۔ ممتاز مفتی، علی عباس جلالپوری، مبارک علی، بانو آپا اور قدرت اللہ شہاب کی تصانیف نے اس شغف کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ ہر طرح کی کتاب کے مطالعے کو میری عادتِ ثانیہ بنا دیا؛ مگر اس وقت کبھی یہ خیال بھی دل میں نہ آیا تھا کہ کبھی میری اپنی کوئی تحریر کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے گی۔

اخبارات میں مختلف موضوعات پر لکھنے کا آغاز تو 1992ء میں ہی ہو گیا تھا، مگر 98–1997ء کی ایک نہایت خوش گوار صبح تھی جب گجر خان میں استادِ عصر، معروف صوفی اور دانش ور پروفیسر احمد رفیق اختر سے پہلی باقاعدہ ملاقات نصیب ہوئی۔ اس نشست میں انہوں نے اپنے مخصوص، دل نشیں اور پُر اثر انداز میں نہایت شفقت سے مجھ سے فرمایا: ''لکھا کرو''۔ اپنی دائمی سست روی کے سبب تسلسل تو قائم نہ رہ سکا، مگر گاہے بگاہے مختلف اخبارات و جرائد میں سیاست، مذہب، سماجیات اور علم و فن جیسے موضوعات پر ''افقِ خاور''

کے نام سے قلم اٹھاتا رہا۔ بنیادی طور پر ہر شاعر یا ادیب اپنے باطن کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے لکھتا ہے، مگر معروف انشائیہ نگار ''ایمی دی گارمان'' کے مطابق، ''قلم کار جب اپنی ذات پر لکھتا ہے تو درحقیقت اپنے عہد اور اپنے زمانے ہی کی تصویر کھینچ رہا ہوتا ہے۔''

میرے نہایت عزیز دوست، معروف مترجم، ماہر لسانیات اور دانشور محمد زبیر نے خلوص اور محبت کے ساتھ یہ ذمہ داری اپنے سر لی کہ میرے منتشر کالمز اور مضامین کا انتخاب کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔ مگر یہاں بھی میری وہی دائمی سست روی آڑے آئی۔ محمد زبیر نے اپنی فہم، محنت اور اخلاص سے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ کتاب کی اشاعت سے متعلق تمام امور کو خود اپنے سبک رفتار مگر مستعد ہاتھوں میں لے لیا۔ اس بے لوث تعاون پر احقر کے دل سے ان کے لیے بے شمار دعائیں نکلتی ہیں۔

حسبِ روایت ہی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چند شکریے ایسے ہیں جو مجھ پر قرض کی طرح واجب ہیں، اور جن کی ادائیگی نہ صرف فرض بلکہ باعثِ سکون اور موجبِ برکت بھی ہے۔

سب سے پہلے اپنے استادِ محترم احمد رفیق اختر کے حضور سراپا تشکر ہوں، جنہوں نے نہ صرف میری فکر کے دھارے بدل دیے بلکہ میرے اندر سوچنے کا نیا قرینہ بھی پیدا کیا۔ انہوں نے مجھے محض خداشناسی کا درس ہی نہیں دیا بلکہ اس راہ کی سمتیں بھی دکھائیں، جس کا احسان عمر بھر نہیں اتارا جا سکتا۔

پروفیسر نثار اے شیخ کے لیے میں کبھی اپنے دلی جذبات کا حق ادا نہ کر سکا۔ آج بھی دل میں ان کے لیے بے پایاں احترام، محبت اور نیک تمنائیں موجزن ہیں، جن کا اظہار الفاظ کے دائرے میں ممکن نہیں۔

ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کے لیے بھی دل سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ شاد و کامران رہیں۔ ان کی صحبت نے مجھے روایت سے ہٹ کر سوچنے اور سننے کا حوصلہ عطا کیا، جو فکری آزادی کی پہلی سیڑھی ثابت ہوا۔

پیر صفدر علی شاہ بخاری بھی اللہ کی جنتوں میں ہمیشہ آسودہ رہیں۔ اللہ سے گڑگڑانے، مانگنے اور جڑنے کی تحریک اور اس کا سلیقہ انہی سے ملا۔ اس مقام پر یہ طے کرنا دشوار ہے کہ مجھے اپنی کتاب کے شائع ہونے کی خوشی زیادہ ہے یا اپنے دو برادرانِ قلم کے خلوص بھرے، ماہرانہ اور بے لاگ تبصروں کی مسرت۔

معروف شاعر و ادیب جناب محبوب صابر (محبوب بھائی) اور جانے پہچانے ماہرِ تعلیم، ادیب اور دانش ور، ڈائریکٹر آئی ایل ایم گجرات جناب سید انجم محمود گیلانی (انجم بھائی)، آپ دونوں کے لیے دل سے یہ دعا ہے کہ اللہ آپ کو مزید عزت، ترقی اور قلبی آسودگی عطا فرمائے۔ آپ کی حوصلہ افزائی میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

میرے اور میری اس کتاب کے لیے یہ اعزاز بھی کسی سعادت سے کم نہیں کہ معروف کہانی کار، شاعر اور نقاد جناب نصیر احمد نصیرؔ، ممتاز ماہرِ تعلیم و ادیب اروند گپتا (پُونے، بھارت)، جناب جنگ بہادر گوئل (چنڈی گڑھ، پنجاب) اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے معروف ماہرِ تعلیم ڈاکٹر کلیان سنگھ کلیانؔ نے اپنی گراں قدر آرا سے اس کتاب کو وقعت بخشی۔ میں ان سب کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف اس کتاب کی قدر و قیمت بڑھا دی بلکہ اس خاکسار کو اپنی قلمی کاوش جاری رکھنے کا حوصلہ اور اعتماد بھی عطا کیا۔

اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور دیگر تکنیکی امور میں خلوص اور دل جمعی سے معاونت کرنے پر محترمہ سنبلہ ملک، محترمہ اسما سلیم اور محترمہ عمارہ ناظم کے لیے بھی دل سے دعائیں اور صمیمانہ اظہارِ تشکر پیش کرتا ہوں۔

آخر میں اس کتاب کی اشاعت کے اہتمام پر "سُلیکھ بک میکرز" اور ان کی ٹیم کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ "سُلیکھ بک میکرز" اردو، پنجابی گورمکھی، پنجابی شاہ مکھی، ہندی اور انگریزی میں کتب کی اشاعت کا وسیع، متنوع اور قابلِ اعتماد تجربہ رکھتے ہیں، جس کی جھلک ان کے شائع کردہ معیاری کام میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ امر نہایت مسرت اور فخر کا باعث ہے "اُفقِ خاور" اس وقت شائع ہونے جا رہی ہے جب سال 2025 میں منعقدہ "تیسری پنجابی انٹرنیشنل کانفرنس" میں سُلیکھ بُک میکرز کو "پنجابی پبلشرز ایوارڈ" سے نوازا گیا ہے۔ اس اہم اعزاز پر سُلیکھ بُک میکرز اور اس کی پوری ٹیم کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں زبان، ادب اور کتاب کے فروغ کی اس خدمت میں مزید کامیابیاں اور دوام عطا فرمائے۔

خاور سلہری

☆☆☆

سیرتِ محسنِ کائنات کا ایک ورق۔۔۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

رودادِ 12 ربیع الاول!

صبح صادق کا وقت ہے!

پیر کا دن!

بادِ نسیمِ ٹھنڈک ابھی باقی ہے!

ہر چیز تازہ دم ہے!

پرندے چہچہا رہے ہیں!

روشنی اندھیرے کو مٹا رہی ہے!

سورج اپنی چمک سے دنیا کو روشن کرنے کو ہے!

کائنات ایک نئے دن کی ابتدا کرنے کو ہے!

عرب میں بہار کا موسم ہے!

جب پھول کھلتے ہیں!

سبزہ اُگتا ہے!

ہر چیز کھِلی کھِلی ہوتی ہے!

ہر شے خوبصورتی اور تازگی کا احساس دیتی ہے!

بہار کا پہلا مہینہ ربیع الاوّل اپنے گیارہ دن گزار چکا ہے یہ بارہویں دن کی صبح ہے!

اپریل کی 22 تاریخ اور سال 571 عیسوی ہے۔(سیرت ابن ہشام:158/1)

کعبہ کو تباہ کرنے کے ارادہ سے آنے والی ہاتھیوں کی فوج کے انجام کو پچپن دن گزر چکے ہیں!
ایرانی بادشاہ نوشیرواں کی بادشاہت کا چالیسواں سال ہے!
شفاء بنت عوف اور فاطمہ بنتِ عبداللہ بی بی آمنہ کے پاس موجود ہیں!
بنی ہاشم کا سارا خاندان دعا مانگ رہا ہے!
سب اس خوش خبری کے انتظار میں ہیں کہ بی بی آمنہ کے گھر اولاد ہو گی!
"عبداللہ کی اولاد"
وہ عبداللہ جو سب کا پیارا تھا!
وہ عبداللہ جو جوانی میں سب کو چھوڑ کر اپنے ربّ کے پاس چلا گیا!
عبدالمطلب ہر سانس کے ساتھ اپنے ربّ کے حضور دعا مانگ رہے ہیں!
اتنی دعائیں تو عبدالمطلب نے اپنی کسی اولاد کے لیے نہیں مانگی تھیں!
عبداللہ کی والدہ فاطمہ بنت عمرو کی دعائیں سانسوں کے ساتھ چل رہی ہیں!
آمنہ کے گھر بیٹا پیدا ہو تو سمجھیں گی عبداللہ مل گیا!
ہر طرف خوشبو پھیلی!
اس قدر روشنی پھیلی کہ دور دور تک دیکھا گیا۔ (مسند احمد: 4/184، سبل الہدیٰ و الرشاد: 1/342، سیرت ابن ہشام: 1/158)
مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو!
بی بی آمنہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے!
ہر طرف یہی آوازیں ہیں!
بنی ہاشم کو جتنی خوشی اس بیٹے کے پیدا ہونے کی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے!
سب کی دعا تھی کہ عبداللہ کے گھر بیٹا پیدا ہو، اللہ کریم نے ان کی دعائیں قبول کر لیں!
ابولہب کی کنیز ثویبہ بھی اِدھر ہی سے بھاگی بھاگی آئی اور سب سے کہنے لگی!
"مبارک ہو، بی بی آمنہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ عبداللہ کا بیٹا پیدا ہوا ہے"
اپنی کنیز کی آواز سن کر ابولہب نے بھتیجا پیدا ہونے کی خوشی میں ثویبہ کو آزاد کر دیا ہے (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری: 2/95)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کا کمال دیکھیں دنیا میں آتے ہی غلاموں کو آزادی نصیب ہونے لگی۔ یہ کیسا یتیم پیدا ہوا ہے جو یتیموں اور بے بس لوگوں کے لیے اللہ کی رحمت بن کر آیا ہے۔ ثویبہ کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ غلامی سے آزادی ملنا، عرب میں زندگی ملنے سے بڑی خبر ہے!

کچھ تاریخ دانوں کے مطابق رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ 9 ربیع الاوّل، کچھ کے مطابق 12 ربیع الاوّل اور کچھ کے مطابق 17 ربیع الاوّل کو پیدا ہوئے!

عبد المطلب کے 9 بیٹے اِس وقت جوان ہیں اور 2 بیٹے بہت چھوٹی عمر میں ہیں!

عبد اللہ وفات پا چکے ہیں!

سب کو جیسے بھائی کا نعم البدل مل گیا ہے!

عبد المطلب کو اپنی 100 سالہ زندگی میں اتنی خوشی نہیں ملی جتنی اس خبر نے دی ہے!

عبد المطلب کو ایسے لگ رہا ہے جیسے جوانی واپس لوٹ آئی ہے!

پوتے کو گود میں لیا، ماتھا چوما اور اپنے سینہ سے لگایا۔ اس قدر خوبصورت بچہ، یقیناً یہ بڑے نصیب والا ہو گا!

عبد المطّلب نے اپنے تین سال کے بیٹے عباس کو اپنا پوتا دکھاتے ہوئے کہا:

"یہ دیکھو اپنا بھائی کتنا پیارا ہے"

عبد المطلب خدا کے حضور سجدۂ شکر بجالائے اور کعبہ کا طواف کیا ہے!

دادا نے سرور کائنات صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کا نام "محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ)" اور ماں نے "احمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ)" رکھا!

مدحتِ شافعِ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ) محشر پہ مقرر رکھا!\
میرے مالک نے مرے بخت کو یاور رکھا!\
میں نے قرآن کی تفسیر میں سیرت کو پڑھا!\
نور کو دائرہ نور کے اندر رکھا!\
خاتمیت کا شرف آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کو بخشا اور پھر\
آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی دسترسِ خاص میں کوثر رکھا!

مدحتِ رسول صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ اور احقر کی بساط کیا، کائنات کے تمام روشن اذہان مل کر بھی یہ فریضہ بعنوان احسن ادا نا کر سکیں۔

میرے استاد گرامی نے فرمایا کہ اگر میں نعت کہتا تو کہتا کہ

”محمد (صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ) بس خدا نہیں ہیں۔

☆☆☆

بندہ صحرائی لباسِ جدید میں۔۔۔!

محلہ پوٹھوہار ہزاروں سال سے زرخیز تو شاید اتنا نہیں جتنا مردم خیز ہے۔ اس خطے میں جرنیلی سڑک کے کنارے آباد گجر خان شہر کے ایک قدیمی محلے میں ایک وسیع و عریض مکان ہے جہاں ایک حیرت کدہ آباد ہے۔ بے حد و بے کنار آباد ہے، جہاں نا صرف علم و عرفان کے سوتے پھوٹتے ہیں بلکہ بے پایاں محبت بھی موجزن ہے۔ تصوف اور دین کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی خود انسانی تاریخ ہے۔ عام طور پر جب کسی صوفی یا درویش کا ذکر ہوتا ہے تو انسانی ذہن میں جو پہلی شبیہ پیدا ہوتی ہے اس سے لگتا ہے کہ ایک بوڑھا پراگندہ سا آدمی لمبی سفید داڑھی اور ہاتھ میں موٹے منکوں والی تسبیح پکڑے کسی برگد کے درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھا ہوگا اور قطار اندر قطار چیلے سر جھکائے کھڑے ہوں گے جنہیں اندھی تقلید کی لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہوگا۔ سوال کرنا شجرہ ممنوع ہوگا۔ لیکن اس دانش کدے میں ایسا نہیں ہے یہ تو ایک روشن و درخشاں شخصیت والا 82 سالہ پُرکشش صوفی ہے۔

پروفیسر احمد رفیق اختر 14 اپریل، 1941ء کو گجر خان کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ جو وہاں سے نکلے اور ڈسکہ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد گوجر خان میں آباد ہوگئے۔ انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا اور پھر لاہور میں اسی مضمون کے استاد مقرر ہوگئے۔ کتاب بینی خود آگاہی، متنوع علم اور سوچ بچار شخصیت کا خاصہ تھے۔ ان کے ہم عصر انہیں "رفیق اختر جوگی" کے نام سے بھی جانتے تھے "جوگ" کے سفر پر نکلے رفیق اختر خداشناسی اور مقام محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کی راہداریوں میں آنکلے۔

خدا شناسی کے سفر میں سرکاری نوکری پر ''چار حرف'' پڑھ کے واپس اپنے آبائی شہر لوٹ آئے اور بظاہر ظروف فروشی سے منسلک ہو گئے لیکن بقول ان کے انہوں نے اللہ کی نوکری اختیار کر لی اور اللہ کا یہ نوکر اب بجائے ''رفیق اختر جو گی'' کے ''پروفیسر احمد رفیق اختر'' اور ''استادِ محترم'' ہو گئے اور اب اسی قدیمی گھر میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگوں کی ذات کے نوکیلے کونوں کو علم و عرفان کی ''سان'' پر گول کرتے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے استادِ محترم۔۔۔

استادِ محترم کے بقول انسانی اعزازات میں اوّلین مقام عقل کو حاصل ہے اور اس عقل کا صرف اور صرف ایک استعمال ہے کہ اللہ اور اللہ شناسی کو براستہ رسول ہاشمی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ اپنی زندگی کی ترجیحِ اوّل بنالیا جائے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اللہ سے ہمارا اوّلین تعلق محبت کا ہے اور محبت کا یہ گوہرِ بے پایاں صرف قرآن نہیں، اور اک مقام محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ اور اتباع رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔''

ان کے بقول اللہ کی توجہ اور اس کی یاد تسبیح میں ہے۔ اس لیے نا صرف خود بلکہ ان کے لاکھوں شاگرد ہاتھوں میں تسبیح لیے ذکر خدا، فکر خدا اور خیال رسول کائنات صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ میں مشغول ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ آج کی نوجوان نسل کو کسی 'گلٹ' اور 'خوف' کا شکار کیے بغیر انہیں خدا سے اُس کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ سے قرآن سے اسلام سے، کائنات سے، روحانیت سے، سائنس سے اور علم و دانش سے جوڑتا ہے اور ان تمام علوم کا ماخذ وہ صرف قرآن مجید کو سمجھتے ہیں۔ ان کے بقول انسان کا بنیادی انحراف اُس کا اپنے پیغام ازل سے ہٹ جانا ہے وہ وعدہ جو انسان نے ''یوم اَلست'' میں خدا سے کیا تھا اور پیغامِ ازل کی طرف لوٹنا انسان کی ترجیحِ اوّل ہے۔ کامیابی کی کنجی ہے، دوسرے جہاں کی آسودگی اور قربتِ خداوندی ہے۔ پروفیسر صاحب نے تخلیق کائنات اور انسانی حقائق تلاشِ خدا تصورِ رحمتِ خداوندی اور بندگی کو آسان لفظوں میں سمو دیا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''خدا فراق سے پہچانا جاتا ہے وصال سے نہیں''

پروفیسر صاحب رسول کائنات صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کو عظیم ترین انسان اور خدا کا رفیق مانتے اور سمجھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''ہم تو ابھی تک کرہ ارض کے رازوں سے کماحقہ آگاہ نہیں ہوئے اور نامعلوم خدا نے اور کتنی کائناتیں بنا رکھی ہیں لیکن ان تمام کائناتوں کا اللہ صرف ایک اور ربّ العالم ہے اور محمد صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ ہی تمام کائناتوں کے لیے رحمت اللعالمین ہیں۔

معروف کالم نگار جناب ہارون الرشید صاحب نے کہیں لکھا تھا کہ ''کم و بیش 25 برس پہلے معروف شاعر افتخار عارف مجھے پروفیسر احمد رفیق اختر کے ہاں گجر خان لے گئے تھے پھر وہ لوٹ آئے تھے لیکن میں وہیں کا وہیں رہ گیا تھا''، ایسا صرف ہارون الرشید صاحب کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ ہم ایسے بلا مبالغہ لاکھوں لوگ ہیں جو گجر خان کے قدیمی گھر کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں اپنے دل و جان چھوڑ آتے ہیں۔ معروف صحافی اور Speaker Motivational جاوید چوہدری نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ''اگر کوئی مجھ سے پوچھے زندگی کی سب سے بڑی محرومی کیا ہے تو جواب دوں گا کہ زندگی کا وہ وقت جو میں نے استادِ محترم سے شناسائی سے پہلے گزار دیا اور سب سے بڑا حاصل پروفیسر صاحب سے ملاقات''۔

پروفیسر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے علم اور تکبر کے سنگھاسن پر بیٹھ کر گفتگو نہیں کرتے۔ ہم جیسے کج فہم لوگ بھی ان کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور دیدہ دلیری دیکھیے کہ کبھی کبھی ان سے اختلاف بھی کر لیتے ہیں مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ بُرا منائیں یا ماتھے پر شِکن آئے۔ ان ہی کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''صوفی اپنے سینے میں بغض نہیں پالتا اور نہ ہی دعوی کرتا ہے۔''

مرحوم جنرل حمید گل نے ایک بار حیرت سے کہا تھا کہ ہم نے عمر بھر ملٹری سائنس پڑھی ہے لیکن استادِ محترم اس کے بغیر ہی بالکل درست نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کے ایک اہلِ علم، مسند نشیں، اہلیان جُبہ و دستار اور فقیہانِ سماج استادِ محترم کے گھر کی سیڑھیاں چڑھا اور انگشت بدنداں علم و آگاہی، خداشناسی اور محبت رسول صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ لے کر لوٹ آیا۔ لیکن پروفیسر صاحب اس کے باوجود فخر و غرور سے دور پیکر علم و انکسار کی تصویر بنے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کسی دوسرے ''شاگرد'' کے لیے چشم براہ ہوتے ہیں اور ہم ایسے کئی دوسرے بھی قطار اندر قطار اپنی باری کے منتظر ہوتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کے حُسن اخلاق کی اساس وہ ہے جسے زوال نہیں۔ یہ سبق انہوں نے اللہ کی کتاب سے سیکھا اور اسکے سچے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ سے لیا۔ ان کی کوئی گفتگو با خدا اور ذکر رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کے بغیر نہیں ہوتی۔

غالب کا یہ شعر اب تواُن کے لاکھوں شاگردوں کو بھی انکی وساطت سے ازبر ہو گیا ہے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

پاکستان اور قائد اعظم محمد علی جناح سے آپ کو خاص لگاؤ ہے۔ پروفیسر صاحب کے بقول آج کے مسلمانوں کا المیہ دینی مسابقت اور مطابقت کا فقدان ہے، ہم مغرب سے اور جدید سائنس سے مرغوبیت کا شکار ہیں۔ خوامخواہ کے غیر ضروری اندیشے پال رکھے ہیں اور ان سے نجات ترجیحاتِ زندگی کو مرتب کرنے سے ہی ممکن ہے۔

بقول پروفیسر صاحب کہ:

"ان کی وجہ شہرت ان کا اللہ سے کیا ہوا معاہدہ ہے اور وہ لوگوں کو اللہ کی طرف دلیل سے مائل کرتے ہیں۔"

دلیل پر اپنی گفتگو ہی پروفیسر صاحب کا طرہ امتیاز ہے۔ پروفیسر صاحب کے لہجے میں اللہ نے وہ تاثیر رکھی ہے کہ ایک ایک لفظ دل و دماغ میں اترتا محسوس ہوتا ہے اور پھر وہیں گھر کر لیتا ہے۔

تشخیص بجا ہے کہ ہمیں عشق ہوا ہے
نسخے میں لکھو ان سے ملاقات مسلسل

☆☆☆

نسخہ کیمیا

حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ عارفی رحمتہ اللہ علیہ پیشہ کے اعتبار سے ہومیو پیتھک معالج تھے اور مطب (کلینک) کرتے تھے۔

جید علماء ان سے بیعت ہوئے، جیسے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب وغیرہ ڈاکٹر صاحب سے بیعت ہوئے۔

مشہور کتاب اسوۂ رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ ڈاکٹر صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

ایک دفعہ حاضرین مجلس سے فرمانے لگے:

"آپ کہاں لمبے لمبے مراقبے اور وظائف کروگے۔ میں تمہیں اللہ کے قرب کا مختصر راستہ بتائے دیتا ہوں۔ کچھ دن کر لو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے، قرب کی منزلیں کیسے طے ہوتی ہیں۔"

1۔ اللہ پاک سے چُپکے چُپکے باتیں کرنے کی عادت ڈالو۔ وہ اس طرح کہ جب بھی کوئی جائز کام کرنے لگو دل میں یہ کہا کرو:

اللہ جی!

ا۔ اس کام میں میری مدد فرمائیں۔

ب۔ میرے لئے آسان فرمادیں۔

ج۔ عافیت کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔

د۔ اپنی بارگاہ میں قبول فرمالیں۔

یہ چار مختصر جملے ہیں، مگر دن میں سینکڑوں دفعہ اللہ کی طرف رجوع ہو جائے گا اور یہ ہی مومن کا مطلوب ہے کہ اسکا تعلق ہر وقت اللہ سے قائم رہے۔

2۔ انسان کو روز مرہ زندگی میں چار حالتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔۔

ا۔ طبیعت کے مطابق۔

ب۔ طبیعت کے خلاف۔

ج۔ ماضی کی غلطیاں اور نقصان کی یاد۔

د۔ مستقبل کے خطرات اور اندیشے۔

جو معاملہ طبیعت کے مطابق ہو جائے اس پر" اللھم لَكَ الحمدُ ولَكَ الشُّکر " کہنے کی عادت ڈالو۔

جو معاملہ طبیعت کے خلاف ہو جائے تو" إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ " کہو۔

ماضی کی لغزش یاد آجائے تو فورا" استغفر اللہ" کہو۔

مستقبل کے خطرات سامنے ہوں تو کہو" اللھم إنّی أعوذ بكَ مِن جَمِیعِ الفِتَنِ ما ظَھَرَ مِنھا وما بَطَن۔"

"شکر" سے موجودہ نعمت محفوظ ہو گئی۔

نقصان پر صبر سے اجر محفوظ ہو گیا اور اللہ کی معیت نصیب ہو گی۔۔

"استغفار" سے ماضی صاف ہو گیا۔۔

اور "اللھم انی أعوذ بک" سے مستقبل کی حفاظت ہو گئی۔۔

3۔ شریعت کے فرائض و واجبات کا علم حاصل کر کے وہ ادا کرتے رہو اور گناہِ کبیرہ سے بچتے رہو۔

4۔ تھوڑی دیر کوئی بھی مسنون ذکر کر کے اللہ پاک سے یہ درخواست کر لیا کرو:

"اللہ جی! میں آپ کا بننا چاہتا ہوں، مجھے اپنا بنا لیں، اپنی محبت اور معرفت عطا فرمادیں۔"

چند دن یہ نسخہ استعمال کر و پھر دیکھو کیا سے کیا ہوتا ہے اور قرب کی منزلیں کیسے تیزی سے طے ہوتی ہیں۔!!!

☆☆☆

یادِ رفتگان

سورج سر مژگاں ہے اندھیرے نہیں جاتے
ایسے تو کبھی چھوڑ کے بیٹے نہیں جاتے
تو جانبِ صحرائے عدم چل دیا تنہا
بچے تو گلی میں بھی اکیلے نہیں جاتے
جو پھول سجانا تھے مجھے تیری جبیں پر
بھیگی ہوئی مٹی پہ بکھیرے نہیں جاتے!

بوڑھے کندھوں پر جوان بیٹے کا لاشہ دنیا کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔ جو ہم بھائیوں نے گزشتہ دس دنوں میں دوبار اٹھایا ہے۔

کتاب و سنت میں بہت سی نصوص ملتی ہیں جو صبر کرنے والوں کی فضیلت اوران کے لئے اجرِ عظیم پر دلالت کرتی ہیں، اوراللہ ربّ العزت انہیں بغیر حساب کے اجر وثواب عطا کرے گا، یہ اجر وثواب ہر اس شخص کے لئے ہے جو کسی بھی مصیبت پر صبر کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بیٹے کا فوت ہونا والدین کے لئے بہت بڑی مصیبت اور آزمائش ہے، لہٰذا جو بھی اس پر صبر کرے اور اللہ ربّ العزت کی رضا اور تقدیر پر راضی ہو اسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ اجرِ عظیم حاصل ہو گا،

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

"اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک و پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے، اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے، جنہیں جب کبھی کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، ان پر ان کے ربّ کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں" البقرة(155-157)

اور ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے" آل عمران(146)

اور ایک مقام پر اللہ جل شانہ کا فرمان ہے:

اللہ تعالیٰ یقیناً صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے اجر و ثواب دے گا" الزمر(10)

اور احادیث رسول کائنات صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ بھی ہیں کہ:

امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

"مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے ہر معاملہ میں خیر ہی خیر ہے، یہ مومن کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں، اگر مومن کو کوئی آسانی اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس پر اللہ کا شکر کرتا ہے تو یہ اس کے لئے بہتر اور خیر ہے، اور اگر اسے کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے یہ اس کے لئے بہتر اور خیر ہے" صحیح مسلم(5318)

امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ابوسنان رحمۃ اللہ تعالیٰ سے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں میں نے اپنے بیٹے سنان کو دفنایا اور قبر کے کنارے ابو طلحہ خولانی رحمۃ اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے تھے جب میں نے نکلنا چاہا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے "ابوسنان کیا میں تمہیں خوشخبری نہ دوں؟" میں نے جواب دیا "کیوں نہیں"، تو انہوں نے کہا:

"مجھے ضحاک بن عبدالرحمن بن عرزب رحمۃ اللہ نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث بیان کی کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

"جب کسی بندے کا بیٹا فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے!"

"تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی"

تو وہ کہتے ہیں:

"جی ہاں"

تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

"تم نے اس کے دل کا پھل اور ٹکڑا قبض کر لیا"

تو وہ کہتے ہیں

"جی ہاں"

تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے

"میرے بندے نے کیا کہا؟"

تو فرشتے جواب دیتے ہیں

"اس نے تیری حمد و تعریف اور انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھا"

تو اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ:

"میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر تیار کر دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو"

جامع الترمذی حدیث نمبر (942)

علامہ البانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کو السلسلۃ الصحیحۃ (1408) میں حسن قرار دیا ہے۔

اور مصیبت کے وقت ہمیں نبی صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ایک دعا سکھائی ہے جس میں بہت فضیلت اور اجر عظیم ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بیان کیا ہے وہ کہتی ہیں کہ: "میں نے رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ"

"جس مسلمان شخص کو بھی کوئی مصیبت پہنچے اور وہ وہی کہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے (انا اللہ وانا الیہ راجعون) اور یہ دعا پڑھے کہ (اَللّٰھُمَّ أْجُرْنِی فِی مُصِیبَتِی وَأَخْلِفْ لِی خَیْرًا مِنْھَا إِلَّا أَخْلَفَ اللہُ لَہُ خَیْرًا مِنْھَا) اے اللہ میری مصیبت میں مجھے اجر دے اور اس کا نعم البدل عطا فرما"

ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ جب ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوت ہوئے تو میں کہنے لگی "ابو سلمہ سے کون سا مسلمان بہتر ہے سب سے پہلا گھر جو رسول کریم صَلَّی اللہُ

عَلَيۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی طرف ہجرت کر کے آیا پھر میں نے یہ دعا پڑھ لی تو اللہ تعالی نے مجھے اس کے بدلے میں رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَيۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ دیئے۔" صحیح مسلم حدیث نمبر (1525)

پس ہم نے اپنے دو بیٹے "اسامہ قمر" اور "بلال حبیب" اللہ ربّ العزت کے حوالے کیے اور خدا کے فیصلے کے آگے سر جھکایا۔ اللہ ربّ العزت سے امید واثق ہے کہ وہ انہیں رسول کائنات صَلَّی اللّٰہُ عَلَيۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور خانوادہ رسالت مآب صَلَّی اللّٰہُ عَلَيۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے طفیل اپنی جنتوں میں آسودہ رکھے گا، اور ان کے والدین کے لیے توشہ آخرت بنائے گا اور فضل رکھے گا۔ انشاءاللہ !

اللہ تعالی سے دعا گو ہوں کہ آپ کو مصیبت سے محفوظ رکھے اور کوئی امتحان پیش آئے تو صبر دے اور اس کے بدلے میں بہتر اور اچھا بدلا عطا فرمائے۔

واللہ اعلم

☆☆☆

اپنی کھڑکیاں صاف رکھیں

ایک نو بیاہتا جوڑا دل میں ارمان اور زندگی کے خواب سجائے ہنی مون پر کسی پر فضا پہاڑی مقام کے خوبصورت ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہر صبح روشن جب دلہن کھڑکی سے پردے ہٹاتی تو وہ دیکھتی کہ سامنے والی چھت پر ایک خاتون گندے کپڑے تار پر سوکھنے کے لیے پھیلا دیتی ہے اور شام کو اتار لیتی اور ایسا گزشتہ کئی روز سے ہو رہا تھا۔ جوڑا حیرانگی سے اس حماقت پر روز بات کرتا۔

ایک روز دلہن نے پردہ ہٹایا تو دیکھا کہ اس روز خاتون نے صاف کپڑے سوکھنے کے لیے چھت پر پھیلائے ہیں۔ اس نے اپنے شوہر کو بتایا کہ آج اس عورت نے صاف کپڑے سوکھنے کو پھیلائے ہیں۔ تب ہوٹل کے باہر چہل قدمی کر رہے شوہر نے بتایا کہ گزشتہ روز میں نے دیکھا کہ کھڑکی بہت گندی ہے میں نے اسے صاف کر دیا۔۔۔ خاتون کے کپڑے تو صاف ہی ہوتے تھے ہماری کھڑی گندی تھی۔ ہم سب کی اپنی اپنی کھڑیاں گندی ہیں۔ جس سے باہر کا ہر منظر دھندلا نظر آتا ہے۔ بغض، کم علمی، احساسِ برتری، کمینگی، گھٹیا پن، تعصب، سیاسی و مذہبی فرقہ واریت اور تنگ نظری کی کھڑکی سے باہر دیکھیں تو ہر منظر گندا اور خراب نظر آتا ہے۔

تیسری دنیا کے غریب اور سطحی مذہبی اپروچ کے حامل ممالک بالعموم اور پاکستان بالخصوص اس اخلاقی انحطاط کے شدید شکار ہیں۔ اگر فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار ذہنوں کا مطالعہ کریں تو انہیں ہر مخالف یا اعتدال پرست ملحد، کافر یا کم از کم راہ راست سے بھٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ مادر پدر آزاد طبقے کو مذکورہ بالا سب دقیانوسی اور بنیاد پرست نظر آتے ہیں۔ سب دوسروں کے بارے میں صرف رائے نہیں رکھتے بلکہ فیصلہ کن رائے رکھتے ہیں لیکن مجال ہے کہ وہ رائے حُسنِ ظن پر مبنی ہو۔

بابا صاحبا (اشفاق احمد) کہا کرتے تھے کہ "سچ بولنے کا شوق ہے تو اپنے بارے میں بولا کریں۔ اپنے کڑوے سچ سے دوسروں کی زندگیاں کیوں اجیرن کرتے ہیں"۔

جبکہ یہاں تو اک طرفہ تماشا یہ ہے کہ سچ بھی مفقود ہے جھوٹ، اپنی اُفتادِ طبع، تربیت اور تنگ نظری کے سہارے ہی دوسروں کی زندگیاں عذاب بنا رکھی ہیں۔ کیوں۔۔۔! آپ کریں گے میری ذات پر تبصرہ، آپ کے لیے بنایا گیا ہوں کیا؟؟ سوشل میڈیا، فیس بک اور واٹس ایپ وغیرہ ہماری ذہنی پسماندگی کا چیخ چیخ کر رونا رو رہے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی صاحب (وہ بھی زیرِ عتاب رہے ہیں) کہا کرتے ہیں کہ "اس جہل کے معاشرے میں جو چیز سب سے زیادہ ناپید ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں اختلاف رائے کا ہنر نہیں آتا۔ ہماری تربیت اس نہج پر نہیں ہوئی کہ کسی طور دوسرے کی عزت نفس اور احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس سے اختلاف کیا جائے۔ یہ اس معاشرے کا حال ہے جس کے ہادی و استاد رسالت مآب صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ ہیں کہ جنہوں نے کوڑا پھینکنے والی کی بھی تیمار داری کی، جنہوں نے دوسروں کے جھوٹے خداوں کو بھی برا کہنے سے روک دیا"۔

ارباب حل و عقد۔۔۔
اے فقیہان دین۔۔۔
اے دانشوران سماج۔۔۔!

کیا وقت نہیں آگیا (بلکہ وقت رہ ہی کہاں گیا ہے؟) کہ معاشرے کی اخلاقی تربیت کا ہنگامی بنیادوں پر انتظام کیا جائے۔ درسگاہوں، الیکٹرک، پرنٹ اور سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہوئے سوشل سائنسدان معاشرے کی تربیت کریں۔ علاوہ ازیں ساتھ ساتھ اب یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ مہذب ملکوں کی طرح سوشل میڈیا اور میڈیا کے لیے سخت قوانین بنائے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے، ذاتی زندگیوں میں مداخلت، بغیر ثبوت کے الزامات، جھوٹ کا پرچار، بے ہودگی کی ترویج اور معاشرتی انارکی پھیلنے کے سلسلے کو کہیں تو لگام دی جا سکے۔ ورنہ اگر ایک ٹانکا بر وقت نہ لگایا گیا تو نو لگانے سے بھی معاشرے کی برہنگی کو نہ روکا جا سکے گا۔

☆☆☆

خود کو تبدیل کریں اپنے لیے اپنے بچوں کے لیے

کیا علم والے اور بغیر علم والے برابر ہو سکتے ہیں (القرآن)

ہر گز نہیں علم کا سب سے بڑا اور اہم ماخذ صرف اور صرف کتاب اور صاحب علم کی مجلس ہے۔ فیس بک، یوٹیوب، ٹی وی ڈرامہ، سیل فون اور انٹرنیٹ ذہنی پسماندگی، نفسیاتی عارضے، اخلاقی گراوٹ، سُستی اور نقاہت تو پیدا کر سکتے ہیں مگر کتاب کا متبادل نہیں ہو سکتے، علم کی آبیاری نہیں کر سکتے اور نہ اخلاقی تربیت میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

براہِ کرم بچوں سے ریڈنگ کروائیں، بچوں کو پڑھ کر کے سنائیں، کچھ دیر سکرین سے ہٹ کر یہ ماحول زندہ کریں، بچوں کو اپنے ساتھ جوڑیں تاکہ آپس میں باتیں کرنے والا معاشرہ پروان چڑھے۔ باتوں سے مزید باتیں جنم لیں اور انسان ایک دوسرے سے ہم کلام ہونے کی لذّت سے از سرِ نو آشنا ہوں، باتیں کرنے والی فضا دم توڑ رہی ہے۔ سکرین والی سموگ ہر سُو بڑھ رہی ہے اور اس کے اندر معاشرے کا دم گھٹ رہا ہے۔ بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی لیڈرشپ پردہ سکرین پر تھرکتے کارٹون اور ویڈیو گیمز نے لے رکھی ہے، یوں جیسے بچے گھر میں بیٹھے بٹھائے اغوا کر لیے گئے ہیں۔

یاد رکھیں! سکرین والا مواد انتشار کو جنم دیتا ہے، جبکہ کتاب یکسوئی عطا کرتی ہے۔

کتاب پڑھیے اور پڑھائیے!

کتاب آپ کو دھوکہ نہیں دیتی، بُری سے بُری کتاب بھی آپ کو کچھ نیا سکھا کے جاتی ہے۔ خواہ وہ آپ کی لغت میں چند نئے الفاظ کا اضافہ ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆

طرزِ فکر، خوشی اور ہم

90 فیصد الجھنیں اور پریشانیاں ہماری خود کی پیدا کردہ ہیں اور ہمارے طرز فکر سے جنم لیتی ہیں۔ ہم زندگی بھر ڈیپریشن، انگزائیٹی اور ذہنی الجھاؤ کا شکار رہتے ہیں اور اسی باعث ناخوش بھی کہ ہمیں وہ ماحول اور حالات ہی میسر نہیں ہوتے جن میں رہ کر ہم خوش رہ سکیں۔ حالانکہ وہ کسی کو بھی دستیاب نہیں ہوتے۔

طرزِ فکر ہمیں آسودہ رکھتا ہے۔

استادِ محترم پروفیسر احمد رفیق اکثر اپنی گفتگو میں ایک خدائی نکتہ بیان کرتے ہیں کہ:

"اللہ کے بندوں کو حُزن و ملال نہیں ہوتا"

مگر یہ ممکن صرف طرزِ فکر سے ہے۔

زمانہ خراب ہے۔

میرے اردگرد سب خراب ہے لوگ رشوت خور، جھوٹے، بدکردار، بہتان تراش مفاد پرست اور کمینے ہیں۔

میری نند، ساس، کولیگز، اور رشتے دار گھٹیا ہیں۔

میں بیمار ہوں۔

کسی کو میرا خیال نہیں ہے۔

زندگی ایسے ہی گزر جانی ہے۔

بعض لوگوں کی نظر میں خوشی کا تعلق حالات سے ہوتا ہے۔ شاید وہ کہیں کہ:

"مجھے خوشی تب ہو گی"

"جب میرے پاس پیسہ ہو گا"

”جب میری ازدواجی زندگی خوشگوار ہو گی“

’جب میری صحبت اچھی ہو گی“

لیکن سچ تو یہ ہے کہ خوشی کا ہمارے حالات اور ماں باپ سے ملنے والی خصوصیات سے اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا کہ ہماری سوچ سے ہوتا ہے۔

”ہم ایسا کیوں کہہ سکتے ہیں؟“

کیونکہ اپنے حالات اور ماں باپ سے ملنے والی خصوصیات پر تو ہمارا زیادہ اختیار نہیں ہوتا مگر ہماری سوچ پر ہمارا اختیار ضرور ہوتا ہے۔

پاک کلام میں بتایا گیا ہے:

”شادمان دل شفا بخشتا ہے لیکن افسردہ دلی ہڈیوں کو خشک کر دیتی ہے۔“(امثال22:17)

اس کا مطلب ہے کہ ہماری سوچ اور مزاج کا ہماری زندگی پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہماری سوچ اس بات پر بھی اثر ڈالتی ہے کہ ہم اپنے کسی منصوبے کو پورا کریں گے یا پھر بے دل ہو کر اسے بیچ میں ہی چھوڑ دیں گے اور ہم زندگی میں آنے والی مشکلوں سے سیکھیں گے یا پھر ان سے بیزار ہو جائیں گے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ ان باتوں سے اتفاق نہ کریں۔ شاید وہ کہیں:

”جب میری زندگی میں اتنی مشکلات ہیں تو میں اپنے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجا کر کیوں رکھوں؟“

”میری سوچ چاہے جتنی بھی مثبت ہو، اس سے میرے حالات تو نہیں بدلیں گے۔“

ذرا اس کو پلٹ کر دیکھیں۔۔۔

”جو کمیاں مجھے دوسروں میں نظر آتیں ہیں وہ کچھ کچھ مجھ میں بھی ہیں۔“

تو دوسروں کو space ملنا شروع ہو جائے گی۔ حالات، چیزیں اور ماحول نارمل لگنا شروع ہو جائے گا۔

ہم نہ ہوں گے تو کسی اور کے چرچے ہونگے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

مثبت سوچ سے آپکے ارد گرد سب مثبت ہونا شروع ہو جائے گا اور منفی سوچ سے ارد گرد بھی سب تلپٹ ہی نظر آئے گا۔

یہ خدا کا آفاقی اصول ہے۔

طرزِ فکر بدلیں تو زندگی حسین تر ہے۔ آپکے پاس بہت کچھ ہے جو لاکھوں کروڑوں کے پاس نہیں ہے مگر منفی طرزِ زندگی کی وجہ سے آپ اس سے لطف ہی نہیں اٹھا پا رہے۔

18 ستمبر 2019

☆☆☆

رسمی تعلیم ہر ایک کے لیے نہیں

ہمارے ہاں عمومی طور پر تعلیم کا ایک محدود تصور پایا جاتا ہے۔ سائنس اور سوشل سائنسز کو تعلیم سمجھا گیا ہے جب کہ رسمی یا غیر رسمی طور پر ہنر مندی کا حصول تعلیم میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس مضمون میں تعلیم کا وہی عمومی تصور زیرِ بحث ہے جس میں ہنر مندی شامل نہیں۔ تعلیم آج ہر کس و ناکس کا مسئلہ بنا دی گئی ہے۔ یہ ایک مبالغہ آمیز سماجی رجحان بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سماج کا ہر فرد تعلیمی رجحان لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ تمام تر کوشش کے باوجود اور تعلیم پر بھرپور وسائل خرچ کرنے والے ممالک میں بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ ہر بچے کو سائنس یا سوشل سائنسز کے میدان میں تعلیم یافتہ بنایا جا سکے۔

فطری رجحانات کو بدلا نہیں جا سکتا۔ تعلیم اُسے ہی حاصل کرنی چاہیے جس میں تعلیمی رجحان پایا جائے۔ ہمارے ہاں سائنس اور سوشل سائنسز کی تعلیم کے میدان ہی اوّلین ترجیح ہوتے ہیں۔ ان مضامین کا رجحان نہ رکھنے والے طلبہ کی ناکامی کے بعد انہیں بادل نخواستہ ہنر مندی یا کاروبار کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے لیکن تب تک عموماً طالب علم کا بہت وقت ضائع چکا ہوتا ہے۔ تعلیم ہمیشہ سے مڈل کلاس کا مسئلہ رہا ہے۔ مگر تعلیم کے کمرشلائز ہو جانے اور سٹیٹس سمبل بن جانے کی وجہ سے اشرافیہ بھی اس کے گاہک بن گئے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کا دربار پڑھے لکھے نورتنوں سے سجتا تھا مگر اس کے لیے اکبر کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہ تھا۔ اشرافیہ اپنے وسائل سے وہ میدان سجاتے جہاں پڑھے لکھے مڈل کلاس اپنے علم و ہنر سے انہیں اور خود کو بھی فائدہ پہنچایا کرتے تھے۔ تعلیم اشرافیہ کا مسئلہ ہے نہ ان کی فطری صلاحیتوں کا حقیقی میدان۔ مگر محض سماجی رتبے کے حصول کے لیے انہیں بھی کوئی ڈگری حاصل کرنا پڑتی ہے جس کا کوئی استعمال ان کی عملی زندگی میں عموماً نہیں ہوتا۔

ادھر غریب اس کوشش میں ہوتا ہے کہ اس کا بچہ پڑھ لکھ کر اچھا کمانے کے قابل ہو جائے، اپنی تمام جمع پونجی اس کی تعلیم پر خرچ کر دیتا ہے مگر وہ معیاری تعلیم نہیں دلوا سکتا۔ کامیابی کے لیے اس کا بچہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہیے اور ایسے کتنے ہوتے ہیں۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ میٹرک، ایف اے بی اے کروا کر اس کا بچہ اب ریڑھی لگانا بھی پسند نہیں کرتا اور نہ کسی دکان پر بیٹھنا پسند کرتا ہے، اس لیے کہ دفتر کی ملازمت کا خواب اس کی آنکھوں میں سجایا گیا تھا۔ ریڑھی لگانے یا دکان پر ملازمت کرنا یا اپنی دکان کھولنے کے بعد وہ ہر بندے کو ساری زندگی یہ دکھڑا سناتا رہتا ہے کہ وہ غربت کی وجہ سے پڑھ نہ سکا ورنہ آج بڑا افسر ہوتا۔ ادھر حال یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والے ملازمتوں کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں یا بہت کم تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔

یہی حال اس تاجر پیشہ اور کاروباری خاندان کے بچے کا ہوتا ہے جو تعلیم کے حصول میں اپنے دل و دماغ کی توانائیاں خرچ کرنے کے بعد کاروبار کی وسیع آمدنی کے مقابل اپنی کم تر آمدنی والی ملازمت سے پریشان ہو کر اپنی تعلیم میں صَرف کیے جانے والے وقت کو کوستے دیتا ہے۔ وہ اب کاروبار کے قابل نہیں رہتا یا اُسے سب نئے سرے سے سیکھنا پڑتا ہے اور عموماً وہ اچھا کاروباری وارث ثابت نہیں ہو پاتا تعلیمی ڈگری کو سٹیٹس سمبل نہیں سمجھنا چاہیے۔ اسے بھی ایک مہارت سمجھنا چاہیے۔ آدمی کی عزت اس کی کنٹریبیوشن کی وجہ سے ہونی چاہیے چاہے وہ بڑھئی ہو یا معمار، محض سند یافتہ ہونا کوئی معیار نہیں۔

قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والے، جسمانی محنت کا طبعی رجحان رکھنے والے تکنیکی قسم کے ذہن رکھنے والے افراد تعلیم کے لیے طبعی رجحان عموماً نہیں رکھتے۔ انہیں تعلیم میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ پرائمری سطح کی تعلیم تو عام ہونی چاہیے لیکن اس کے بعد بچوں کا رجحان پرکھنے کا جامع طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ماہرین تعلیم کو بلا کر جامع پلان ترتیب دینا چاہیے اور صرف منتخب بچوں کو ان کے رجحان کے آگے پڑھانا چاہیے۔ اس طرح اداروں پر طلبہ کے ناروا بوجھ میں بھی کمی ہو گی اور سماج ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق تربیت دے کر زیادہ مفید شہری بنا سکتا ہے۔

☆☆☆

اشتہا انگیز اشتہارات

کس بد بخت شوہر کا جی نہیں چاہتا کہ وہ گھی کا کنستر لے کر گھر میں داخل ہو اور اس کی بیوی کچن میں توبہ شکن انگڑائیاں لیتی ہوئی مخمور نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے لٹکنے مٹکنے لگے ؟

کس بیچاری بہو کا دل نہیں چاہتا کہ سارا دن خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے اور کوسنے دینے والی ساس ایک مخصوص برانڈ کی کھیر بنانے پر اس کے صدقے جانے لگے ؟

کون نہیں چاہتا کہ چائے کی پیالی ہاتھ میں آتے ہی رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس نوجوان لڑکوں لڑکیوں اور زنخوں کا ایک گروہ اس کے ارد گرد دیوانہ وار ناچنے لگے ؟

وہ کون سے لڑکے ہیں جو سارا دن محلے میں لفنگوں کی طرح کرکٹ کھیلتے ہیں جبکہ ان کی مائیں چیخ چیخ کر انہیں سودا لانے کا کہتی ہیں اور جب شام کو وہ کولڈ ڈرنگ کی بوتل اٹھائے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو سارا خاندان ان کی بلائیں لیتے نہیں تھکتا؟

وہ کون سے باس ہیں جن کے لاکھوں روپے کے موبائل کام نہیں کرتے اور ان کا ایک ملازم اڑھائی ہزار کا ایک چینی موبائل ان کے سامنے لا کر پھینکتا ہے تو باس ملازم کی عقل و دانش کا قائل ہو جاتا ہے اور اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دے ڈالتا ہے ؟

کون ہیں وہ لوگ جو دلہنوں کی مانند زرق برق رنگا رنگ شیروانیوں میں ملبوس ہو کر لوگوں سے قرآن سے متعلق سوال پوچھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یار ٹکا ہی لگا دو!

کہاں ہے وہ بنک جو لاکھوں کے اکاؤنٹ پر چند سو روپے ماہانہ سود کی مد میں ادا کرتے ہیں اور انہی ماہانہ ادائیگیوں کی بنا پر کھاتہ دار کروڑوں کی بی ایم ڈبلیو خرید سکتے ہیں ؟

کہاں ہیں وہ سگھڑ بیبیاں جو واشنگ پاؤڈر کے ایک ڈبے کے بجائے دو خرید کر بچت کر لیتی ہیں کہ چند ماہ میں ہیرے جڑے زیورات پہن لیتی ہیں؟

کہاں ہیں حفظانِ صحت کے وہ ماہرین جو آپ کے گھر میں گُھس آتے ہیں اور آپ کے باتھ روم میں فلش کے اندر ہاتھ مار مار کر آپ کو بتاتے ہیں کہ ان کا باتھ روم ڈیٹر جنٹ ہی سب سے بہتر ہے؟

کہاں بنتی ہیں وہ کاریں جن میں سوار شوہر جب دیر سے گھر پہنچتا ہے تو بیوی ہاتھ میں پکڑا بیلن یا چھری ایک جانب پھینکتی ہے اور وہ دونوں ہنسی خوشی لانگ ڈرائیو پر نکل جاتے ہیں؟

کہاں ہیں وہ بچے جو دن بھر شور شرابا غل غپاڑہ مچا کر ماں کا سر کھاتے ہیں اور جیسے ہی ان کے سامنے مرچ مصالحوں والی دو منٹ میں تیار میکرونی کا پیالہ رکھا جاتا ہے وہ ننھے فرشتوں کی مانند انہیں نوشِ تن کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں؟

اور کہاں ہیں وہ مائیں جو اپنے بچوں کو سفید براق لباس پہنا کر باہر بھیجتی ہیں اور چند لمحوں بعد وہ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لتھڑے واپس لوٹتے ہیں اور خوشی سے نہال مائیں انہیں اپنی بانہوں میں بھر لیتی ہیں؟ ’’کیونکہ داغ تو اچھے ہوتے ہیں!‘‘

کون ہیں یہ لوگ جو یہ سب کچھ کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں؟

یہ وہ لوگ ہیں جو اس شیطانی بکس کے اندر رہتے ہیں جسے ہم ٹی وی یا ٹیلی ویژن کہتے ہیں۔ اور یہ سب لوگ ایک ایسے سحر میں گرفتار ہیں جسے اشتہار بازی یا ایڈورٹائزنگ کہتے ہیں۔ وکیلوں، پراپرٹی ڈیلروں اور کار ڈیلروں کی مانند اشتہاری کمپنیوں کا بھی ایک منتر ہے۔ جھوٹ بولو اور یوں منہ بھر کے اور ’’جبڑہ جما کے بولو‘‘ کہ خود بولنے والے کو بھی یقین ہونے لگے کہ یہی سچ ہے۔ یوں بھی ہمارے ایسے معاشرے میں سچ کے لیے کوئی منطق لازم نہیں۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو کھرا سچ بنانے کے لیے صرف گورا چٹا، دبلا پتلا ہونا اور صنفِ نازک سے تعلق ہی کافی ہے۔ اگر اس دبلے بدن کو موسیقی کی دھن پر اُفقی رُخ میں متواتر ہلایا جائے تو کھرا سچ پتھر پر لکیر ہو جاتا ہے۔ گورا چٹا اور دبلا پتلا ہونا اتنا لازم ہے کہ اس کی موجودگی میں تیسری شادی کی بھی کچھ خاص پابندی ضروری نہیں۔

منطق کی غیر موجودگی کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ شیو بنانے والی کریم کی افادیت بھی خود استعمال کرنے والا مرد نہیں بتا سکتا۔ اس کے لیے بھی ایک خاتون کا مرد کے گالوں کو سہلانا اور پھر قبولیت کے انداز میں مسکرانا لازم ہے۔

عورتیں بھی لپک لپک کر ایک مخصوص واشنگ پاؤڈر ہی خریدتی ہیں کہ وسیم اکرم کا کہنا ہے کہ وہی سب سے اچھا واشنگ پاؤڈر ہے۔ قسم لے لو جو ہمیں وسیم اکرم اور واشنگ پاؤڈر کے درمیان سوائے 'و' کے کوئی بھی قدر مشترک دکھائی دی ہو۔

راقم کا ٹی وی کے اشتہاروں پر سے اس دن ہی ایمان اٹھ گیا تھا جب ایک روز دیکھا کہ مردوں کے لیے بھی رنگ گورا کرنے والی کریمیں آ گئی ہیں۔ دکان پر پہنچا اور مطلوبہ کریم طلب کی تو دکاندار نے پوچھا:

"کیا کیجیے گا؟"

میں بولا: "لگاؤں گا اور کیا کروں گا!"

دکاندار نے اپنے سیلز بوائے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

"آپ کا کیا خیال ہے یہ پچھلے چھ مہینوں سے کیا لگا رہا ہے؟"

لوڈشیڈنگ کی ماری سیاہ رنگت والے سیلز بوائے کو دیکھا تو جی میں آیا کہ کہہ ڈالوں:

"بوٹ پالش!"

دکاندار بولا: "جایئے قبلہ، اچھی خاصی بُھنی ہوئی گندم جیسی رنگت ہے۔ چھوڑیں ان چونچلوں کو۔ اب تو ماشااللہ آپ کی شادی کی عمر ہے کوئی بھی دے گا۔"

جو آپ کو دکھایا جاتا ہے ویسے نہیں ہوتا، صرف آپ کے خیالات اور ایمان پہ ڈاکہ ڈالنے کی سعی کی جاتی ہے اور خاص کر رمضان میں یہ کوشش مزید تیزی سے شروع کر دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے طوائفیں، رنڈیاں اور عریانی کا مظاہرہ کرنے والے سروں پے دوپٹے ڈال کر مومنہ بن کر آپ کے ایمان کو ہائی جیک کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے کیسے بچنا ہے۔

☆☆☆

کون سکھائے گا؟

میرا تعلق اس نسل سے ہے، جس کی زندگی میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن (پی ٹی وی) کا بڑا اہم حصہ رہا ہے۔ پی ٹی وی کے ستّر کے عشرے کے ڈرامے تو ہم نہ دیکھ سکے، اَسّی کے عشرے سے ٹی وی ڈرامہ دیکھنے کا موقعہ ملا اور یہ ماننا چاہیے کہ زندگی کی بہت سی خوشیاں اور مسرت انگیز لمحات ٹی وی کی بدولت ملے۔

خیر مقصد یہ بتانا تھا کہ شام کو ڈرامہ دیکھنے کی ایسی عادت بنی کہ اب جب بھی شام کو گھر میں ہوں اور وقت مل جائے تو انٹر ٹیمنمنٹ چینلز دیکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ پچھلے کچھ عرصہ میں پاکستانی چینلز کے گیم شوز دیکھنے کا اتفاق ہوا، کیبل کی وجہ سے بھارتی چینلز بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں، ان کے پروگرام بھی دیکھے اور لاشعوری طور پر موازنہ بھی کرتا رہتا ہوں۔

کون بنے گا کروڑ پتی بھارت کا ایک مشہور ٹی وی کوئز شو ہے۔ یہ کوئز شو سولہ سترہ سال پہلے شروع ہوا اور آج کل اس کا ''نواں سیزن'' چل رہا ہے۔ پہلے سیزن میں سب سے بڑا انعام ایک کروڑ تھا، اس سال یہ رقم سات کروڑ ہے۔ فارمیٹ کچھ یوں ہے کہ ہر سوال کے ساتھ پیسے بڑھتے جاتے ہیں۔ دس بارہ سوالات کے بعد معاملہ پچاس لاکھ اور ایک کروڑ تک چلا جاتا ہے۔ ایک کروڑ سے اگلا سوال سات کروڑ کے جیک پاٹ انعام تک رسائی دلا دیتا ہے۔

مشہور بھارتی اداکار امیتابھ بچن کون بنے گا کروڑ پتی کے میزبان ہیں۔ پہلا سیزن بھی انہوں نے کیا اور حالیہ سیزن بھی وہی کر رہے ہیں۔ درمیان میں ایک سیزن شاہ رخ خان نے بھی کیا، مگر وہ رنگ نہ جما پائے۔ امیتابھ بچن کی اپنی ایک خاص گریس فل شخصیت

ہے۔ گزشتہ برسوں میں اس کے کئی پروگرام دیکھے، رواں سیزن کا ایک پروگرام دیکھا اور پھر دانستہ نیٹ سے تین چار مزید اقساط بھی بغور دیکھیں۔ تین چار چیزیں مجھے بڑی دلچسپ اور اہم لگیں۔

یہ اندازہ ہوا کہ اس پروگرام کے ذریعے دانستہ طور پر پوری بھارتی قوم کے لئے امید کی ایک کرن پیدا کی گئی۔ پروڈکشن بہت عمدہ ہے۔ شرکاء کے حوالے سے بڑی دلچسپ اور معلوماتی چھوٹے چھوٹے ویڈیو کلپس بنائے گئے ہیں۔ ان کے گھر جا کر انٹرویوز کیے گئے، ان کے ماحول، گھر والوں کو دکھایا گیا اور مستقبل کے عزائم کے حوالے سے بھی بات چیت ہوتی رہی۔ جیسے ہی کوئی مہمان مختلف سوالات کے جوابات دے کر آگے بڑھتا ہے، وہ فوٹیج دکھائے جاتے ہیں۔ پچھلے سیزن میں بھی یہ بات نوٹ کی تھی، اس سال بھی ایسا ہی ہو رہا ہے کہ زیادہ تر شرکا کا تعلق لوئر مڈل کلاس اور غریب گھرانوں سے ہے۔ نہایت پسماندہ ماحول میں رہنے والے مرد یا عورتیں، مگر ان کے حوصلے بلند ہیں اور وہ اپنی محنت اور ذہانت سے یہ پروگرام جیت کر اپنی زندگیاں بدلنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

اکثر جیتنے یا آگے جانے والے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی بنگال، کوئی تامل ناڈو، کرناٹکا یا پھر کوئی اسی ہفتے ایک کروڑ جیتنے والی خاتون کی طرح جھاڑ کھنڈ کا رہائشی نکلا۔ جھاڑ کھنڈ نہایت پسماندہ اور دوسرے خوشحال صوبوں سے خاصا پیچھے ہے۔ اس خاتون نے ہر ایک کو اپنے اعتماد اور پختہ فکری سے متاثر کیا۔ گھریلو خاتون ہونے کے باوجود وہ اپنے علاقے میں سماجی کام کر رہی ہے، شو میں اس لئے آئی کہ انعامی رقم سے اپنے سوشل ورک کو آگے بڑھا سکے۔ پروگرام کا فارمیٹ اور اس کا شہرہ آفاق میزبان تو اپنی جگہ کشش رکھتا ہی ہے، جو فوٹیج دکھائے گئے، ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ انہیں دیکھ کر لاکھوں کروڑوں مزید بھارتیوں کے دلوں میں محنت کر کے کوئز شو جیتنے کا خواب پیدا ہوا ہو گا۔

اہم بات مجھے یہ لگی کہ اپنے نوجوانوں کو وہ کون بنے گا کروڑ پتی ٹائپ پروگراموں کے ذریعے امید اور تبدیلی کے سپنے دیکھنا سکھا رہے ہیں۔ اس کے لئے شارٹ کٹ نہیں بلکہ محنت، ذہانت اور مستعد دماغ شرط ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے "کے بی سی" جیسے پروگراموں میں جاؤ مگر وہاں تکے بازی یا شارٹ کٹ سے لاٹری نہیں ملے گی۔ جو محنت کرے گا، وہ آگے جائے گا۔

اس کے بر عکس ہمارے ہاں احمقانہ، مضحکہ خیز گیم شوز چل رہے ہیں۔ ہاتھ استعمال کئے بغیر منہ سے تربوز کھانا، غبارے پھوڑنا، باسکٹ میں گیندیں پھینکنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میزبان کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے موٹر سائیکل، موبائل، گاڑی وغیرہ جیتنے کی کوشش کرنا۔ پاکستانی گیم شوز کو دیکھ کر لگتا ہے جو جتنا لالچی، گھٹیا اور عزت نفس سے عاری ہے، اسے اتنا بڑا انعام ملے گا۔ کہیں پر بڑی بڑی گاڑیاں ریوڑیوں کی طرح بانٹی جا رہی ہیں تو کہیں پر سیروں کے حساب سے سونا انڈیلا جا رہا ہے۔ کوئی میزبان شرکا میں کیچ کیچ کے نعرے لگاتا ہوا موبائل اچھال رہا ہے لگتا ہے۔

ان شوز کو بنانے والے میں تخلیقی صلاحیت ہے نہ اتنا ویژن کہ نوجوانوں کو شارٹ کٹ نہیں سکھانا بلکہ انہیں یہ بتانا ہے کہ اَن تھک محنت اور کوشش کے بغیر زندگی تبدیل نہیں ہو سکتی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ صرف اپنی زندگی بدلنا کوئی بڑی بات نہیں، اصل کامیابی تو یہ ہے کہ انسان اپنے ارد گرد کا ماحول تبدیل کرے۔ جس دنیا میں رہتا ہے، اسے خوبصورت بنائے، وہاں سے کانٹے چن لے، دکھ کم کرنے اور خوشیاں دینے کی کوششیں کرے۔ یہ باتیں اپنے سکول، کالج دور کے ، پی ٹی وی میں ہم نے دیکھیں۔ افسوس کہ ہمارے آج کے انٹرٹینمنٹ چینل چلانے اور تفریحی پروگرام بنانے والوں کو یہ بنیادی، سادہ باتیں بتانے والا کوئی نہیں۔

13اکتوبر2019

☆☆☆

ہماری علمی قابلیت

ہم ہندوستان کا مقابلہ کرنے اور اسے ختم کرنے کے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمارا ہندوستان سے کسی میدان میں مقابلہ ہی نہیں۔ ہم ہر میدان میں ہندوستان سے بہت پیچھے ہیں۔ میرا چونکہ موضوع تعلیم و تدریس ہے تو اس لیے اپنا تجربہ آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہوں گا۔ دو ماہ قبل ایک دوست کے مشورے سے یوٹیوب چینل سٹارٹ کیا اور یہ سوچا کہ چینل کا موضوع تعلیم و تدریس ہو گا۔ یوٹیوب پر بہت سارے پاکستانی دوست مختلف موضوعات پر کام کر رہے ہیں اور وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ویڈیو لیکچر ریکارڈ کرتے ہوئے مجھ پر کچھ حقائق آشکار ہوئے جنہیں جان کر میں ششدر رہ گیا۔

ہمارے ہاں تعلیمی موضوعات پر مواد نہ ہونے کے برابر ہے اردو حروفِ تہجی کو یوٹیوب پر سرچ کریں تو وہ تک پاکستانی نہیں ملتے وہ بھی ہندوستان کے یوٹیوب چینلز کے بنے ہوئے ہیں۔ بچوں کے لیے کارٹونز، اخلاقی کہانیاں اور نظمیں تک ہندوستانی یوٹیوبرز بنا رہے ہیں سائنسی موضوعات پر اچھی کوالٹی کا مواد ہمارے ہاں میسر نہیں اور اس پر جو ویڈیو لیکچرز ہیں ان کا انڈیا کے ویڈیو لیکچرز کے ساتھ ہمارا کسی طرح تقابل نہیں بنتا۔

اگر یقین نہ آئے تو "جرمینیشن آ سیڈ" کی ویڈیو ہی سرچ کر کے دیکھ لیں کہ آپ کو ہندوستانی یوٹیوب چینلز سیکڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے جن پر بہتر سے بہتر کوالٹی کی ویڈیوز موجود ہیں لیکن ہمارے ہاں چند ایک ویڈیوز ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ بنانا چاہتے بھی ہوں لیکن جب وہ سرچ انجن آپٹمائزیشن کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تو لوگ ان موضوعات کو سرچ ہی نہیں کرتے۔ تو انہیں کیا مصیبت پڑی ہے جو ان موضوعات پر ویڈیو

لیکچر ز بنائیں۔ پاکستان کا ایک بہت بڑا یوٹیوب چینل جو صرف تعلیمی موضوعات پر ویڈیوز بناتا ہے اس کی ایک سال میں جو ویڈیو سب سے زیادہ دیکھی گئی وہ چھ لاکھ لوگوں نے دیکھی جب کہ ہندوستانی چینل پر دیکھی جانے والی ویڈیو کے ویوز اسّی لاکھ تھے۔

اردو حروفِ تہجی کی ہندوستان کی بنی ہوئی ویڈیو کے ویوز ابھی تک پانچ کروڑ ہو چکے ہیں اور ہمارے ہاں ایسی ویڈیوز کے ویوز سات لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں ان کے کارٹونز کے ایک ایک دن میں دس دس لاکھ کی تعداد میں دیوز ہو جاتے ہیں کیوں کہ ہمارے بچے ان کارٹونز کو مزے سے دیکھتے ہیں اور پھر والدین کا رونا دھونا ہے ہمارے گھر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہمارے بچے ہندو کلچر سیکھ رہے ہیں۔ 'شیو' اور 'برہما' ہمارا ہیرو بن رہا ہے۔

سوال یہ ہے آپ نے بچوں کے لیے کیا کیا ہے؟

انہیں متبادل مواد دیا کیا ہے؟

آپ تو ابھی کارٹونز کا حلال یا حرام ہونا گناہ یا ثواب ہونا ہی طے نہیں کر پا رہے۔

اور آپ کی ترجیح میں بچوں کا مواد ہے ہی کہاں؟

اور بنانے والے بنائیں ہی کیوں ایجوکیشن پر یہاں ویڈیوز دیکھتا ہی کون ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں بچوں کی نظمیں کتنے عشرے قبل لکھنا بند ہو چکی ہیں؟

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے بعد کون سا بچوں کا شاعر آیا جس نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں؟

اب بچوں کے لیے کہانیاں کون سا لکھاری لکھتا ہے؟

اور کہانیوں کی حالیہ کتاب کون سے بچوں کے لیے شائع ہوئی؟

ہم ہر روز یہ راگ الاپ رہے ہوتے ہیں کہ جی ہم یہ سب بچوں کے لیے ہی کرتے ہیں۔ ہمارے بچے ہمارا مستقبل ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سائنس اور ٹیکنالوجی سے تو ہم کوسوں دور ہیں۔

ہمارے ہاں ہر سال کتنی ایجادات پاکستانی طلبا کے نام پیٹینٹ ہوتی ہیں؟

ہم رونا روتے ہیں تعلیمی نظام کا اور ہر بی ایڈ ایم ایڈ کرنے والا ایک رٹا رٹایا جملہ بول دیتا ہے لارڈ میکالے کے نظام تعلیم نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔

تو کون اُٹھا اس نظام تعلیم کو بدلنے؟

اگر چند افراد اپنے تئیں کچھ کردار ادا کر بھی رہے ہیں تو انہیں آپ نے مافیا قرار دے دیا ہے۔

پرائیویٹ سکولز تو کم و بیش ہر ملک میں ہوتے ہیں۔یورپ تو دور ہے آپ گلف ممالک کے سکولز کا ہی چکر لگا لیں تو چکرا جائیں گے کہ اس قدر زیادہ فیسیں۔

ہم مردہ لوگوں کو ہی ہیرو مانتے ہیں۔ زندہ لوگ جو اس قوم کی خدمت کر رہے ہیں انہیں ہم مافیا مانتے ہیں۔

سوچئے جس قوم میں زندہ افراد ہیروز نہیں وہ قوم زندہ کیسے ہو سکتی ہے؟

بند کیجئے نرگسیت میں جیناڈینگیں مارنا اور اپنی تاریخ کو علمی افراد سے جوڑنا۔

☆☆☆

۱۱۵۰ دن کی تاخیر سے دیا گیا پُرسہ

مانا کہ شعر کہنا، جملہ مرتب کرنا اور تصور کو تصویر بنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھ جیسے لکھاری اور کالم نگار کے لیے جو ۱۹۹۲ سے ہزاروں صفحات لکھ چکا ہے۔ ایک پُرسہ دینے، ایک خراجِ عقیدت پیش کرنے، ایک شکریہ کہنے میں ۱۱۵۰ دن کی تاخیر ہو گئی۔ اس کے لیے قاری حیران ہو گا تو میں محوِ حیرت ہی نہیں بوجوہ غمزدہ بھی ہوں۔

پُرسہ اپنے ہی بھائی بہنوں کو دینا تھا۔

خراجِ عقیدت ”ڈیڈی جی“ (جو ۳۰ ستمبر ۲۰۲۲ کو جنت کے راہی ہو لیے، انشااللہ) کو پیش کرنا تھا اور شکریہ ان ہزاروں عزیز و اقارب، قارئین اور دوستوں کا ادا کرنا تھا جنہوں نے جنازے میں شرکت کی، تعزیت کے لیے تشریف لائے، برقی رابطوں سے پُرسہ دیا۔ سب ہمیشہ خوش اور خوشحال رہیں۔

جوانی میں انسان باپ کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جیسے باپ کو ہمارے مسائل، تکلیفوں یا ضرورتوں کا احساس نہیں ہے۔ وہ نئے دور کے تقاضوں کو نہیں سمجھتا۔ کبھی کبھی ہم کم عقلی میں اپنے باپ کا موازنہ بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں ”اتنی محنت ہمارے باپ نے کی ہوتی، بچت کی ہوتی، کچھ بنایا ہوتا تو آج ہم بھی۔۔۔۔۔۔۔۔ فلاں کی طرح عالیشان گھر یا گاڑی میں گھوم رہے ہوتے“۔

کہاں ہو؟

کب آؤ گے؟

زیادہ دیر نہ کرنا!

جیسے سوالات انتہائی فضول اور فالتو لگتے ہیں۔ سویٹر تو پہنا کر، کچھ اور بھی پہن لو سردی بہت ہے۔ انسان سوچتا ہے اولڈ سکول کی وجہ سے والد کو باہر کی دنیا کا اندازہ ہی نہیں۔ اکثر اولادیں اپنے باپ کو ایک ہی معیار پر پرکھتی ہیں۔ گھر، گاڑی، پلاٹ، بنک بیلنس، کاروبار اور اپنی ناکامیوں کو باپ کے کھاتے میں ڈال کر خود سرخرو ہو جاتے ہیں۔

خوش قسمتی، خدا کی مہربانی اور "ڈیڈی جی" کی محنتِ شاقہ کی بدولت مذکورہ بالا تمام آسائشوں سے ہم سرفراز ہوئے مگر صد حیف کہ "ڈیڈی جی" کا کماحقہ شکریہ ادا نہ کر سکے، واجب خدمت نا کر سکے۔

"چوہدری محمد مشتاق سلہریا" نے تقسیمِ ملک سے چند سال پہلے ریاست جموں و کشمیر کے ضلع سامبا، تحصیل رام گڑھ کے گاؤں خواص پور میں ایک متوسط زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی، لیکن جلد ہی قیامِ پاکستان کے باعث گھر بار اور زمین جائیداد چھوڑ کر اپنے والدین کے ہمراہ سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں "چھاؤنی سلہریاں" میں پناہ گزین ہو گئے۔

واجبی تعلیم حاصل کی، نامساعد حالات کے باعث اوائل عمری میں رزق کے کنویں سے اپنے والدین، بھائی اور ہماری بھی زندگی کا سامان کرنے کے لیے جُت گئے۔ پھر ہوا یوں کہ پہلی پیالی سے لے کر پلازہ بنانے تک ہم نے نہیں دیکھا کہ اُن کی زندگی میں چھٹیاں آئی ہوں، آرام کیا ہو، سیر کو گئے ہوں یا تھک گئے ہوں۔

اُن کی اولاد کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ اُن کے "ڈیڈی جی" سب کے ڈیڈی جی تھے۔ اُن کے بھائی، اُن کے بھتیجے، اُنکی بھتیجیاں، اُن کے کزنز کے بچے سب اُنہیں ڈیڈی جی کہتے تھے اور وہ عملاً بھی اُن کے ڈیڈی جی تھے۔ ایمانداری، خدا ترسی، محبت رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ، صلہ رحمی کُوٹ کُوٹ کے بھری تھی۔

اُن کی اولاد تو خیر اُن کے احسانات، محبت اور اُن کی دریا دلی کے بوجھ تلے ہمیشہ شکر گزار رہے گی۔ وہ اپنے وسیع خاندان کے بھی محسن ہیں۔

بس افسوس! کہ جانے میں جلدی کر دی۔ بہت سے خواب تشنہ تکمیل رہ گئے۔ بہت سی خدمتیں ہم سوچتے رہ گئے۔ جن کے باپ مر جاتے ہیں اُن کے صحن میں ایک درخت ہونا چاہیے، زندگی بہت تھکا دیتی ہے۔ کبھی کبھی سائے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ماں کی جمع "مائیں"، "باپ" کی جمع کیا ہے؟

میں نے باپ کے تمام مترادف سوچے۔۔۔۔۔۔
والد، باپ، ابو، ابّا، پِتا، جَنک، باپو، Father,Patro
کسی ایک بھی لفظ کی جمع نہیں مل سکی۔

بہت حیرت سے سوچا،
کہ ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ انسان کی زندگی میں ماں کے رتبے پر بہت سے رشتے جُڑ جاتے ہیں لیکن باپ ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے۔ اس لیے زندگی میں اِس کی کمی کا خلا کبھی پورا نہیں ہوتا۔ باپ ایک رحمتِ خداوندی ہے جو سدا سر پر سائباں کی طرح سایہ دیتا ہے۔ ایک مقدس محافظ جو ساری زندگی خاندان کی نگہبانی کرتا ہے۔ حقیقت میں باپ دنیا کی وہ عظیم ہستی ہے جو اپنے بچوں کی پرورش اور اُن کے روشن مستقبل کے لیے اپنی جان تک لڑا دیتا ہے اور اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بہترین تعلیم و تربیت اور آسودہ معیار زندگی فراہم کرے تا کہ معاشرے میں باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ باپ ایک گھنے سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے جو زمانے کے سرد و گرم سہہ کر اپنے بچوں کو پھل اور سایہ فراہم کرتا ہے۔

مجھ کو چھاؤں میں رکھا اور خود جلتا رہا دھوپ میں
میں نے دیکھا ایک فرشتہ باپ کے روپ میں

کئی بار ڈیڈی جی کے بچوں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنا فرض ہمارے حق سے زیادہ ادا کر چکے ہیں۔ اب محنت کا تیشا چھوڑ کر کچھ سُستا لیں اور اولاد کو موقع دیں تو کہتے کہ:
"میں تے ہجے بُڈھا نہیں ہویا۔"
اور یہ صرف ہمارے ڈیڈی جی نہیں سب کے باپ ہی کہتے ہیں:

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

باپ اپنے بچوں کی آنکھوں کو پڑھ کر خواہش کا پتہ کرلیتا ہے اور اِس خواب کو پورا کرنا اپنا ایمان بنالیتا ہے۔ اپنے بچوں کو زمانے کی سختیوں سے بچا تا ہے۔ بھرے جہان میں باپ ہی تو ہے جو شفقت، نعمت، دریادلی اور جنت کا سایہ ہے۔

باپ کتنا بھی بوڑھا ہو جائے وہ گھر کا سب سے مضبوط ستون ہو تا ہے۔

ہمارے نہیں رہے، خدا آپ کے سلامت رکھے ان کی قدر کیجیے۔

مجھے اپنے "ڈیڈی جی" سے محبت تھی اِس کا مجھے احساس تھا لیکن کتنی تھی، کس نوعیت کی تھی اِس کا پتہ "۱۱ اکتوبر ۲۰۲۲ء" کو ہوا جب اُنہیں جنت کا راہی ہوئے ایک روز ہو چکا تھا اور ان گزرے ۱۱۵۰ دنوں میں یہ احساس روز بروز گہرا ہو تا جا رہا ہے۔ باپ رخصت ہو جائے تو صرف بچے نہیں زندگی بھی یتیم ہو جاتی ہے۔

اِن کے ہونے سے بخت ہوتے ہیں
باپ گھر کے درخت ہوتے ہیں

☆☆☆

امریکی دھمکی، سپریم کورٹ فیصلہ اور رجیم چینج

ڈپٹی اسپیکر رولنگ ازخود کیس کے عدالتی فیصلے کے بعد عمران خان کی حکومت کا خاتمہ اور متحدہ اپوزیشن کے مشترکہ امیدوار شہباز شریف کا وزیر اعظم بننا اب صرف ضابطے کی کاروائی رہ گیا ہے لیکن انگلش محاورے کے مطابق "چائے کے کپ کا، لبوں تک آنے میں ابھی کافی فاصلہ ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے"۔ لیکن جسٹس منیر کے نظریہ ضرورت کے فیصلے سے لیکر اس موجودہ فیصلے تک ایسے تمام فیصلوں کے نتائج صرف فوری بر آمد نہیں ہوتے بلکہ اس کے اچھے اور برے مضمرات قوم دہائیوں تک بھگتی ہے۔ اس فیصلے کو بھی بعض حلقے عدالتی مارشل لا سے تشبیہ دے رہے ہیں۔

3 اپریل کو ڈپٹی اسپیکر قاسم خان سُوری کی آئین کے آرٹیکل 5 کے تحت دی گئی رولنگ پر سیاسی جماعتوں اور قانونی ماہرین کی آرا متضاد ہو سکتی ہیں لیکن کل کے فیصلے کے بعد اب اس کا خلاف آئین و قانون ہونا طے شدہ ہے۔ اب چونکہ عدالتی فیصلہ پاکستانی قوم کی امانت ہے اس لیے اس کے مضمرات پر بات کی جاسکتی ہے۔ ڈپٹی اسپیکر کی رولنگ کی بنیاد وہ امریکی مراسلہ ہے جس میں امریکہ نے پاکستان کو Banana State کہتے ہوئے وائسرائے کی طرح کچھ احکامات جاری کیے جن کے نا ماننے پر نتائج کی دھمکی دی لیکن عدالت کے حالیہ فیصلے میں رولنگ کے خلاف آئین ہونے پر تو فیصلہ دیا گیا لیکن رولنگ کی بنیاد بننے والے امریکی مراسلے پر ایک لفظ نہیں کہا گیا۔ پاک امریکہ تعلقات میں اتار چڑھاؤ اتنا ہی پرانا ہے جتنی پاکستان کی تاریخ۔

1951 میں وزیر اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کو روس نے دورے کی دعوت دی لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت اور امریکی دباؤ کے باعث وزیر اعظم بجائے دورہ روس کرنے کے امریکہ تشریف لے گئے۔

اس کے بعد سنٹو اور سیٹو معاہدے، 1971 کی پاک بھارت جنگ روس اور امریکہ کی سرد جنگ، افغان جنگ، حالیہ دور میں افغانستان سے امریکی انخلا اور 7 مارچ کے امریکی مراسلے تک امریکی دباؤ اور پاکستان کے جھکاؤ کی بھی ایک تاریخ ہے۔ پاکستان میں فوجی قیادت کی تبدیلی، خارجہ پالیسی کی راہیں متعین کرنا اور سیاسی حکومتوں کے قیام کے پیچھے مبینہ طور پر امریکی دباؤ کارفرما رہا یہاں تک کہ چشمِ فلک نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایوب دور کے وزیر خزانہ ڈاکٹر شعیب ہوں یا موجودہ دور کے حفیظ پاشا، امپورٹر وزیر اعظم معین قریشی ہوں یا مشرف دور کے شوکت عزیز، یہ سب امریکہ کی ہی دین رہے ہیں۔

گزشتہ سے پیوستہ ماہ جب وزیر اعظم پاکستان عمران خان نے روس کا دورہ کیا تو اتفاق سے اُسی روز روس اور یوکرائین کی جنگ چھڑ گئی۔ اگر بعض حلقوں کے نزدیک اس وقت دورہ روس کرنا پاکستان کے مفادات کے خلاف تھا تو عسکری قیادت سمیت زیادہ ماہرین نے اس دورے کو صائب قرار دیا۔ یاد رہے اس قدر اہمیت کا دورہ عسکری قیادت کی آشیر باد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے بعد اقوام متحدہ میں روس کے خلاف مذمتی قرارداد میں پاکستان کا ووٹ نا کرنا بھی امریکہ اور یورپی یونین کو کھٹک رہا تھا۔ سونے پر سہاگہ کہ یورپی یونین کے خط کا بھی وزیر اعظم عمران خان نے بڑا دلیرانہ جواب دیا لیکن ایسی گستاخیاں ''انکل سا''م کو کبھی پسند نہیں آئیں پھر وہ ایران کے مصدق ہوں یا سری لنکن حکومت یا عمران خان، انہیں امریکی آقاؤں کی محکم عدولی کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ سفرا کا اور خصوصاً امریکی سفیروں کا سیاسی قائدین یا اہم عہدیداران سے ملاقاتیں کرنا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

2014 کے دھرنے میں خود عمران خان اور جہانگیر ترین کی امریکی سفیروں سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ اس لیے حالیہ دنوں میں بلاول بھٹو، شہباز شریف یا فضل الرحمن کی امریکی سفارت کاروں کے ساتھ ملاقاتیں قابلِ اعتراض نہیں ہیں لیکن ماتھا تب ٹھنکتا ہے جب امریکی قونصل جنرل نے پی ٹی آئی کے بعض غیر اہم MNA's کے ساتھ ملاقاتیں شروع کیں جن میں راجہ ریاض، نور عالم خان، باسط بخاری وغیرہ شامل تھے اور اک طُرفہ

تماشا کہ پھر یہی 22 ایم این ایز کا ضمیر جاگا اور وہ امریکی سفارت کاری اور جناب آصف علی زرداری کی چانکیہ گری کا شکار ہوئے۔

ایک بہت اہم سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ ان منحرف اراکین کے اس اقدام کو لے کر حکومت پاکستان نے ایک صدارتی ریفرنس عدالت عظمی میں دائر کیا جس کا فیصلہ ہنوز تاخیر کا شکار ہے جبکہ اس دوران ڈپٹی اسپیکر رولنگ پر فیصلہ آچکا ہے۔ اگر منحرف ارکان کے بارے میں صدارتی ریفرنس کا فیصلہ بر وقت آجاتا تو یہ یقینی امر ہے کہ حکومت کے اتحادی جو حکومت کو چھوڑ گئے ان کا فیصلہ مختلف ہوتا اس لیے کہ جب گورنر سندھ عمران اسمٰعیل نے ایم کیو ایم کو آفر کی کہ جو معاہدہ آپ جناب آصف علی زرداری صاحب کے ساتھ کر رہے ہیں وہی آپ ہمارے ساتھ کر لیں حتیٰ کہ میں گورنر شپ بھی چھوڑنے کو تیار ہوں جو آپ کو دی جا سکتی ہے۔ اسی پر ایم کیو ایم کے قائد خالد صدیقی نے عمران اسمٰعیل کو جواب دیا کہ آصف علی زرداری نے بیانی آئی کے 17 منحرف اراکین سے ہماری ملاقات کروائی ہے جس کا مطلب ہے اگر ایم کیو ایم حکومت کا ساتھ دے تب بھی عمران خان کی حکومت نہیں بچ سکتی۔

عمران خان کی نرگسیت، مشیروں کے غلط فیصلے فیصلہ سازی میں تاخیر، صدارتی ریفرنس کا فیصلہ نہ آنا اور امریکی دباؤ حکومت کے خاتمے کا باعث ٹھہرا۔ امریکی دباؤ کسی قدر کارگر اور حتمی ثابت ہوتا ہے اس کے لیے بیگم عابدہ حسین کی سوانح عمری Power Failure کا ایک واقعہ پڑھنا سود مند رہے گا جس میں وہ لکھتی ہیں کہ اگست 1992ء میں امریکہ نے نواز شریف کی حکومت تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران آرمی چیف آصف نواز جنجوعہ انتقال کر گئے۔ آرمی قیادت تبدیل ہو گئی، صدر پاکستان نے اسمبلی توڑ دی عدالت نے اسمبلی بحال کر دی۔ پنجاب میں اسمبلیاں توڑنے اور بحال کرنے کا کھیل کھیلا گیا مگر بالآخر جولائی 1993ء میں نواز شریف کی حکومت خود نواز شریف کے استعفیٰ دینے کی بنیاد پر ختم ہو گئی۔ جو فیصلہ انکل سام نے اگست 1992 میں کیا تھا وہ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود جولائی 1993ء میں نتیجہ خیز رہا۔

اب بھی روس یوکرائین جنگ کے تناظر میں امریکہ ان ممالک کی رجیم چینج کرنا چاہتا ہے جو امریکی پالیسیز کے خلاف ہیں یا کم از کم غیر جانبدار ہیں جیسے پاکستان، سری لنکا، ترکی اور ایران۔ ان میں سری لنکا اور پاکستان میں تو وہ کامیاب ہو چکا ہے۔

اب جبکہ عمران خان حکومت کا جانا ٹھہر گیا ہے اور آج حکومت نے لیٹر گیٹ سکینڈل کی تحقیقات کے لیے لیفٹیننٹ جنرل (ر) طارق کی سربراہی میں ایک کمیشن بھی بنادیا ہے جو 90 دن میں اپنی رپورٹ پیش کرے گا اس کا مطلب ہے یہ ایشو نا صرف بہت حساس ہے بلکہ اگلے الیکشن انتخابی مہم کا نعرہ بھی ہو گا اور ابھی چلے گا ایک بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس عدالتی فیصلے کے بعد پاکستان میں سیاسی استحکام آئے گا یا ہم مزید انار کی کا شکار ہوں گے۔ بے شمار معاشی مسائل اور سیاسی عدم استحکام کے لیے شہباز شریف کی زیرِ قیادت بننے والی مخلوط حکومت میں مختلف خیالات اور منشور کی حامل سیاسی جماعتیں شامل ہیں جنہوں نے آئندہ الیکشن میں ایک دوسرے کے خلاف الیکشن لڑتا ہے تو کیا ایسی حکومت کامیاب ہو پائے گی؟ کیا شہباز شریف کی قیادت میں بننے والی حکومت صرف انتخابی اصلاحات کو ختم یا تبدیل کرنے، نیب کو ختم یا اختیارات کم کرنے اور اپنے خلاف بننے والے کرپشن کے کیسز میں ریلیف ہی اس حکومت کا ایجنڈا ہو گا؟ اس لیے کہ موجودہ حالات میں جب بجٹ کی آمد آمد ہے نئے الیکشن ناگزیر ہو چکے ہیں اور شہباز شریف کی زیر قیادت بننے والی مخلوط حکومت میں "بھان متی کا کنبہ جوڑا گیا ہے"۔ ایسی حکومت کے لیے پاکستان کے سیاسی معاشی مسائل کا حل ناممکن ہے۔ یہاں یہ بھی ایک بڑا سوال ہے کیا عمران خان حکومت کی اس تبدیلی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں گے؟ کیا وہ اسمبلیوں سے استعفیٰ دیں گے؟ کیا KPK کی حکومت ختم کر دیں گے اور انتخابات میں جاری اقتدار کی رسہ کشی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ جبکہ امریکہ کے خلاف بتائے گئے بیانیے کو پاکستان کی اکثریت نے پسند کیا ہے۔

حتیٰ کہ KPK کے حالیہ بلدیاتی انتخابی نتائج نے بھی عمران خان اور پی ٹی آئی کو حوصلہ دیا ہے۔ ان حالات کی موجودگی میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور سیاسی قیادت کو کم از کم اور مشترکہ ایجنڈے پر ایک ہو جانا چاہیے اور وہ کم از کم اور مشترکہ ایجنڈا صرف نئے اور ایسے انتخابات ہیں جس کے نتائج پر پاکستان کی کسی سیاسی جماعت کو اختلاف یا اعتراض نا ہو اور اس کے نتیجے میں ایک مضبوط حکومت کا قیام عمل میں آئے جو پاکستان کو درپیش چیلنجز کا مقابلہ کر سکے۔

☆☆☆

بچوں کا کیا قصور؟؟؟

بچہ ایگریسو یعنی متشدد رویے کا شکار ہے تو یہ بات پلّو سے باندھ لیں کہ اصلاح تہذیب، ڈسپلن، تمیز داری اس بچے کی نہیں، خود آپ کی اپنی ضرورت ہے۔ سخت ردِ عمل دینا سخت نا کام رویہ ہے۔ گویا آپ نے بچے کے اندر زندگی بھر کے لئے یہ بات قید کر دی کہ خلافِ مزاج وقوعے پر بھڑک اٹھنا، تھپڑ مار دینا وغیرہ ہی واحد طرزِ ری ایکشن ہے جو ایسی کسی صورتحال میں دینا ہوتا ہے۔ غصے میں پاگل ہو جانے کے علاوہ کوئی آپشن نہیں۔ یہ آپ خود اپنے بچے کو سکھا رہے ہیں، اور توقعات یہ ہیں کہ اس کے نتیجہ میں وہ downcalm یعنی پُرسکون ہو جائے۔ اس طور پر فیڈ ہوا بچہ کسی فیملی اکٹھ کے موقع پر دیگر بچوں سے الجھ کر جب یہی پٹاخے چھوڑے گا تو تب آپ کا خون مزید اُبل پڑے گا۔ منہ بھر کر گالی دینا، طنزیہ جملوں کی برسات کر دینا، کوئی شے دستیاب نہ ہونے پر شور مچا دینا۔۔ آپ کا بچہ یہ سب کیا کرتا ہے؟ اس کی تربیت گاہ خود آپ کی اپنی ذاتِ گرامی ہے۔

ماں باپ یا دونوں۔ بالفرض آپ نہیں، تو اس سب کچھ پر کم از کم آپ کا ردِ عمل متشدد نہ ہو۔ ایسا ہوا تو بچے کے دل و دماغ پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔ وہ جان لے گا یہی "واحد حل" ہے۔ ایک اور بات بھی سیکھ لے گا چیخنے چلانے یا توڑ پھوڑ کرنے سے زیادہ تر توجہ حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی کچھ کرنا ہو گا۔ بارِ دگر عرض کرنا ہے، بچہ متشدد رویئے کا شکار ہے تو اصلاح، تہذیب، ڈسپلن، تمیز داری اب اس بچے کی نہیں، آپ کی اپنی ضرورت ہے۔ بچے کہے کو فالو نہیں کرتے، وہ ہمارے کیے کی نقالی کرتے ہیں اور بس! بچہ تو جیسا ہے سو ہے، ایک پراجیکٹ بن کر آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ چیلنج دے رہا ہے۔ بالکل ایسا ہی ایک معمہ، یا پرابلم جیسے آپ کچن میں رکھے مائیکروویو کو اگلی صبح ہاتھ لگائیں تو بجلی کا جھٹکا لگے۔ جیسی پانی والی

موٹر اچانک بند ہو جائے، یا جیسے گاڑی کا انجن سرِ راہ بے ہنگم شور کرنے لگ جائے۔ تب آپ کیا کریں گے؟ ایک آسان ردِ عمل وہی بے قابو ہو جانا ہے۔ اس چڑچڑاہٹ میں جو شخص پاس ہو، اسے بے نُقط سنانے لگ جائیں، بات بات پر شاؤٹ کریں۔ تاہم، ہر پھر کر آپ کو آنا تو صراط مستقیم پر ہی ہے نا، خواہی نخواہی آپ اس ڈسپلن کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے:

1۔ خرچ کا اندازہ لگائیں گے۔

2۔ اُس مخصوص وقت میں اتنے پیسے پاس نہ ہوں تو صبر کے گھونٹ بھریں گے۔

3۔ جب پیسے ہوں گے تب کسی ایکسپرٹ سے رجوع کر لیں گے۔

4۔ وہ جو کچھ بتائے، اس پر بھروسہ کرنا ہو گا۔

5۔ رزلٹ درست آجانے پر اس کا معاوضہ ادا کر دیں گے۔

گویا مائیکروویو، پانی کی موٹر، اور گاڑی پر گھونسے برسانے، یا مارے چڑچڑاہٹ کے قریب، پاس میں موجود لوگوں پر گلا پھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا بلکہ اس مشکل کے مخصوص حل کی طرف بتدریج رُجوع کرنا ہی راہ نجات ہے۔ بچے میں متشدد رویئے سے نبٹنا ایسا ہی ہے۔ اس پر گرجنے برسنے، پیٹنے، ڈرانے دھمکانے، سب کے روبرو اس کی توہین کرنے تھپڑ جڑ دینے، یا کمرے میں بند کر دینے وغیرہ سے معاملہ وقتی طور پر دب سکتا ہے، تاہم یہ حل بچے کی شخصیت کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔ اس نامعقول اپروچ اندر دو عدد خطرناک نتائج چھپے ہیں:

1۔ ایسا بچہ غیر ضروری طور پر دب جاتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں پر اس کا اعتماد مجروح ہو جایا کرتا ہے۔ بچے کا فزیکل وجود بھی نرم و نازک ہوتا ہے، اور اس کا دُروں بھی پھولوں جیسا۔ بعض والدین سخت ہاتھوں، اور کھردرے رویوں سے یہ پھول مسخ ڈالتے ہیں۔ مدارس میں قرآن پاک پڑھتے بچوں کیساتھ قاری صاحبان کی طرف سے برتی جارہی بے رحمی ایسا ہی عاقبت نا اندیش رویہ ہے ایک نفسیاتی بیماری۔ خیر، جن بچوں کو گھر میں بات بات پر ٹوکا جاتا، ان پر گرجا برسا جاتا ہے نہ کہ ان کے ایشوز کو manage کیا جاتا ہے ایسے بچوں کو ایک استاد کلاس میں کھڑے ہو کر چند سطروں کی ریڈنگ کرنے کو کہہ دے تو راقم نے دیکھا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ ایسے بچے گھبرا جاتے ہیں۔

2۔ یا ایسا بچہ اگر مضبوط اعصابی قوت کا مالک ہے تو ڈھیٹ پروف قسم کا نافرمان اور لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ بات بات پر عزت نفس کو گھائل کئے جانا اس کی معصوم دنیا میں عزت ایسی انمول شے کو بے وقعت بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے "مدار" سے نکلا ہوا ایک ایسا سیارچہ ہے جس کے لئے جیون کے خلائے بسیط میں اب جانے کتنے ہی حادثے رکھے ہیں۔ جو لوگ کسی کے ہاتھوں فیس بک پر بلاک ہوئے پڑے ہیں، وہ ایسی طرزِ تربیت کی زندہ شہادتیں ہیں۔

3۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جو بچے اپنا غصہ وڈپریشن manage کرنا نہ سیکھ سکے، وہ دباؤ میں آکر خودکشی کر بیٹھے۔ وہ اپنے ہمراہ فنکشل ڈپریشن لیکر چل رہے تھے۔ بظاہر ہنستے مسکراتے متحرک۔۔۔ مگر اندرونی طور پر شدید دباؤ کا شکار۔

ایسے حوادث کی بنیادیں گھر کے اندر برسوں پہلے رکھ دی جاتی ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کیساتھ انٹرایکشن کی صورت پیدا ہوتی رہے۔۔۔ یہ ایک پوری درس گاہ ہوتی ہے۔ اس درسگاہ یا انسٹی ٹیوشن کو کیسے خوشگوار اور کارآمد بنایا جائے؟ حل کیا ہے؟ کیسے ٹریٹ کیا جائے ایسے بچے کو؟ اور خود کیسے سیکھا جائے؟ یہ باتیں ذرا سی ٹیکنیکل نوعیت کی ہیں۔ محض اقوالِ زریں پڑھ لینے سے نہیں سیکھی جاسکتی۔ غیر تربیت یافتہ جبلّت جب زور مارتی ہے تو آپ کے اندر رکھی بیسیوں کتابوں، نمازوں، سینکڑوں اقوالِ زریں کو روند ڈالتی ہے۔

☆☆☆

اولاد ایک مشن

اولاد اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ والدین پر ڈالی گئی ایک "عظیم ذمہ داری" بھی ہے۔ بد قسمتی سے آج اکثر والدین اس حقیقت سے نا آشنا ہو چکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ خدا اور معاشرے دونوں کو برے انسان دینے کا سبب بن رہے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کے لیے ان کی اولاد صرف محبت کا موضوع ہوتی ہے۔ وہ ان کی ہُوں پر ہاں کہنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اولاد کو لاڈ پیار کرنا، ان کے نخرے اٹھانا، اولاد کے لیے کپڑوں اور کھلونوں کے ڈھیر لگا دینا، ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرنا ان کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔

ایسے والدین کے لیے ان کی اولاد ابتدا میں ایک کھلونا ہوتی ہے، مگر آہستہ آہستہ وہ خود اپنی اولاد کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن جاتے ہیں۔ اولاد خواہش کی "ڈگڈگی" بجاتی ہے اور والدین "بندر" کی طرح اس ڈگڈگی پر ناچتے ہیں۔ ایسے والدین تعلیم و تربیت کے اعتبار سے اکثر اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک اولاد کے حوالے سے اصل ذمہ داری صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے کسی انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ وہ اولاد کی تربیت کے تصور ہی سے واقف نہیں ہوتے۔

اچھے آداب اور رویوں کی تلقین، نیکی اور معروف کی تعلیم، بڑے چھوٹے کا لحاظ اور خدا اور بندوں کے حقوق کی نگہبانی کو بنیاد بنا کر تربیت کرنے کے بجائے یہ لوگ اولاد کو ٹی وی، موبائل فون اور انٹرنیٹ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اولاد کی ضدوں اور شرارتوں سے نجات کا یہ فوری اور زود اثر نسخہ ہوتا ہے۔ مگر یہ نسخہ اکثر ان کی سیرت و شخصیت کو مسخ کر دیتا ہے۔

ایسے بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو معاشرے میں مفاد اور خواہش کی لہر کو بڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔ صبر، ایثار، قربانی، سادگی، قناعت، عفوو درگزر، امانت و دیانت، عدل و

انصاف اور خوش خلقی جیسی اعلیٰ صفات سے عاری یہ لوگ معاشرے کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف دوسرے انسانوں کو دکھ دیتے ہیں بلکہ خود اپنے والدین کے بڑھاپے کو بھی باعث اذیت بنا دیتے ہیں۔

یہ گویا والدین کی اس کوتاہی کی نقد سزا ہوتی ہے جو انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت کے معاملے میں کی تھی۔ اولاد کی تربیت میں کوتاہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دینے کے لیے آخرت کا انتظار بھی نہیں کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتے ہیں، ان کی اولاد دنیا و آخرت دونوں میں ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوتی ہے۔ ایسے والدین کے لیے ان کی اولاد کوئی کھلونا نہیں ہوتی بلکہ ایک بھاری ذمہ داری اور ایک مقدس مشن ہوتا ہے۔ یہ مشن بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اس مشن کے لیے ہر ممکنہ قربانی دیتے ہیں اور اپنی موت تک اسے جاری رکھتے ہیں۔

وہ اپنے بچوں کو کھلونے ضرور لا کر دیتے ہیں، مگر خود ان کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بنتے۔ وہ اپنے بچوں کی معصوم خواہشوں کو ممکنہ حد تک پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ساتھ ساتھ بچوں کو صبر اور سادگی کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ وہ بچوں کو اعلیٰ اور اچھی تعلیم ضرور دلواتے ہیں، مگر ان کی تربیت سے ہرگز غافل نہیں ہوتے۔ وہ اپنے بچوں پر اعتماد تو کرتے ہیں مگر ان کی ضد کے آگے مجبور ہو کر انہیں ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال کی اجازت ہرگز نہیں دیتے۔ وہ بچوں کی آزادی میں تو حائل نہیں ہوتے لیکن انہیں خدا کی غلامی کا سبق سکھانے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں برتتے۔

اولاد کو اللہ تعالیٰ نے ایک آزمائش قرار دیا ہے۔ اس آزمائش میں سرخرو ہونے کا واحد ذریعہ اولاد کی اچھی تربیت ہے۔ یہی ہر ماں اور ہر باپ کا بنیادی مشن ہونا چاہیے۔

☆☆☆

1965 کی جنگ اور سیالکوٹ

1965 کی جنگ کا سیالکوٹ کے لوگوں کے لئے الگ مفہوم ہے سیالکوٹ کے بچے بچپن سے اس جنگ کے بارے کہانیاں سنتے ہیں کہ کیسے باطن کی دنیا میں مستور رہنے والے سبز پوشوں نے اس جنگ میں سیالکوٹ کو بچانے کا فیصلہ کیا۔ بہت سے لوگ یہ یقین رکھتے ہیں، کہ ایک مرحلے پر دشمن کی عددی قوت اور فوجی صلاحیت غالب آگئی تھی ایسے میں سبز پوش افراد کھائی دیئے جنہوں نے جنگ کا نقشہ تبدیل کر دیا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ 65 میں پڑنے والا بم ایک سبز پوش نے شہر کے وسط کی آبادی پر گرنے سے روک دیا تھا۔ یہ قصے سیالکوٹ کے بچوں کو بچپن سے سننے کو ملتے ہیں اور شہر میں ایسے بھی لوگ مل جاتے ہیں جو اِن سبز پوشوں کو دیکھنے کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ جنگ کی تفصیلات حیرت انگیز ہیں، اس جنگ میں سیالکوٹ کے سول ڈیفنس کے رضاکاروں اور شہریوں نے مالی اور جانی قربانیاں دیں تھیں اس لئے شہر کے لوگ اس جنگ کو بڑے فخر سے یاد کرتے ہیں۔

بھارت نے پاکستان کے جن دو شہروں پر حملہ کیا وہ لاہور اور سیالکوٹ تھے۔ سیالکوٹ پر بھارتی بری فوج کا سب سے مایہ ناز دستہ بکتر بند ایک ڈویژن حملہ آور ہوا۔ اس ڈویژن کے ساتھ تین پیدل فوج ڈویژن (146) اور (26) بھی تھی۔ کہتے ہیں یہ حملہ اس پیش رفت کو رکوانے کے لئے کیا گیا جو پاکستانی فوج آپریشن "جبرالٹر" کے تحت "اکھنور" پر قبضے کے لئے کر رہی تھی۔ اکھنور قبضہ پاکستانی فوج کے لئے ایک اہم دفاعی اور حساس علاقے پر قبضہ ہونا تھا۔ بھارت نے بین الاقوامی سرحد پر حملہ کر کے اس پیش رفت کو روک دیا۔ اس بھارتی حملے کا مقصد جی ٹی روڈ پر قبضہ کرنا تھا تاکہ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ جنگ ٹینکوں کی جنگ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس محاذ جنگ میں ٹینکوں کی پہلی بڑی لڑائی

''پھلروان'' کے نزدیک ہوئی۔ یہ ظفروال اور سیالکوٹ کے درمیان واقع ایک گاؤں ہے۔ 1957 ستمبر اس علاقے میں پاکستانی اور بھارتی ٹینکوں کی خوب لڑائی ہوئی۔ پہلے مرحلے میں بھارتیوں کا پلہ بھاری رہا۔

11 ستمبر کی رات بھارتی فوج نے پھلروان پر قبضہ کر لیا۔ لڑائی میں پاکستانی 35 ٹینکوں سے محروم ہوئے۔ تاہم چونڈہ کی لڑائی کے بعد ان میں سے نو ٹینک پاکستان کو واپس مل گئے جو بھارتیوں کے قبضے میں پہنچ چکے تھے۔ اس معرکے میں بھارتیوں کے چھ سات ٹینک ہی تباہ ہوئے۔ پاکستانی فوج نے پیچھے ہٹنے کے بعد چونڈہ میں دفاعی پوزیشنیں محکم کر لیں۔ اس وقت سیالکوٹ سیکٹر میں بھارتی فوج تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوجیوں پر مشتمل تھی۔ نیز گولے بارود سے لیس 220 ٹینکوں کی کُمک بھی اس علاقے میں پہنچ گئی۔ دوسری طرف میدان جنگ میں صرف پچاس ہزار پاکستانی فوجی موجود تھے۔ ان کے پاس صرف 136 ٹینک تھے۔ بعد ازاں وہاں مزید 15 ٹینک پہنچا دیئے گئے۔

سیالکوٹ سیکٹر میں پاکستانی فوج کے سربراہ میجر جنرل ابرار حسین تھے۔ جن کے ساتھ جنرل ٹکا خاں اور بریگیڈیر عبدالعلی (جنرل اختر ملک کے بھائی) چونڈہ کے محاذ پر شامل ہوئے وہ تجربے کار ثابت قدم اور بہادر فوجی تھے۔ علاقے میں دشمن کی عددی و مشینی قوت بہت زیادہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے ہوش و حواس نہیں کھوئے اور اپنے جوانوں کا حوصلہ بھی بلند رکھا۔ 12 ستمبر سے لے کر 21 ستمبر تک بھارتیوں نے وقتاً فوقتاً چونڈہ میں قائم پاکستانی حصار توڑنے کے لیے کئی چھوٹے بڑے حملے کیے مگر ہر بار انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ پاکستانی افسروں اور جوانوں نے بے مثال دلیری دکھائی اور اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن کو شکست فاش دے ڈالی۔

چونڈہ میں تقریباً 120 بھارتی ٹینک تباہ ہوئے۔ لڑائی کی شدت کا اندازہ یوں لگایئے کہ 800 گز کے فاصلے پر انگریز صحافیوں نے گیارہ تباہ شدہ بھارتی ٹینک دیکھے۔ جنگوں کی تاریخ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ توپوں کا ٹینکوں سے آمنا سامنا ہوا لیکن سیالکوٹ کے محاذ پر ایک وقت ایسا آیا کہ بھارت ہمارے ہر اول پوزیشنوں کو روندتے ہوئے ہمارے توپ خانے پر چڑھ دوڑا اور یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ اس وقت دشمن کے بڑھتے ہوئے حملے کو روکنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت بعض فوجی جوانوں

نے ارضِ وطن کی خاطر قربانی کا فیصلہ کیا، یہ جوان توپوں کے گولے سینے سے باندھ کر بھارتی ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے تھے۔ یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوا۔ جو لوگ جنگ ستمبر کے بارے میں مختلف باتیں سناتے ہیں وہ بھی یہ بات جھٹلا نہیں سکتے کہ سیالکوٹ سیکٹر پر ٹینکوں کی ایک بڑی جنگ لڑی گئی اور اس جنگ میں بھارت کی پیش قدمی روک دی گئی اور اس کو پسپا ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس جنگ میں سیالکوٹ کے شہریوں نے غیر معمولی حوصلے کا مظاہرہ کیا۔ سیالکوٹ کے تاریخی قلعہ ''سالباہن'' پر بم گرایا گیا اور اس سے سیالکوٹ کے بازار گھاس منڈی، بازار کالیاں، بازار کاٹھیاں اور پھولوں والی گلی کو گہرا نقصان پہنچا، سیالکوٹ میں لوگوں نے اس آفت کو بہادری اور حوصلے سے سہا۔ اس لئے سیالکوٹ کو نشانِ استقلال دیا گیا۔ نشانِ استقلال لاہور اور سرگودھا کو بھی دیا گیا۔

☆☆☆

تُوں تُوں میں میں

ہیلن میرن نے ایک بار کہا تھا: ''کسی کے ساتھ بحث کرنے سے پہلے، اپنے آپ سے پوچھیں، کیا وہ شخص ذہنی طور پر اتنا بالغ بھی ہے کہ کسی مختلف نقطہ نظر کے تصور کو سمجھ سکے۔ کیونکہ اگر نہیں، تو بالکل کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہر دلیل اس قابل نہیں کہ آپ اس پر توانائی خرچ کریں۔''

کبھی کبھی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو کتنے واضح طور پر بیان کرتے ہیں، دوسرا شخص سمجھنے کے لئے نہیں سن رہا ہے۔ وہ ردِ عمل دینے کے لیے سن رہے ہوتے ہیں. وہ اپنے نقطہ نظر پر منجمد ہیں، کسی دوسرے نقطہ نظر پر غور کرنے کو تیار نہیں ہیں اور ان کے ساتھ مشغول ہونے سے آپ کو ہی نقصان ہوتا ہے۔

صحت مند بحث اور بے مقصد بحث میں فرق ہے۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ بات چیت جو کھلے ذہن کا مالک ہے، جو ترقی اور سمجھ بوجھ کو اہمیت دیتا ہے، روشن خیال ہو سکتا ہے۔ چاہے آپ سے متفق نہ ہو۔ لیکن اگر کسی ایسے شخص کے ساتھ استدلال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اپنے عقائد سے باہر دیکھنے سے انکار کرتا ہے؟ یہ دیوار سے بات کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ آپ کتنی ہی منطق یا سچائی پیش کرتے ہیں، وہ آپ کے الفاظ کو موڑ دیں گے، انحراف کریں گے، یا رد کر دیں گے، اس لیے نہیں کہ آپ غلط ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ کوئی دوسرا رخ دیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔

پختگی اس بات کے بارے میں نہیں ہے کہ کون دلیل سے جیتتا ہے۔ یہ جاننے کے بارے میں ہے کہ جب کوئی دلیل رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ کا سکون کسی ایسے شخص کو ثابت کرنے سے زیادہ قیمتی ہے جس نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ

اپنا ارادہ نہیں بدلے گا۔ ضروری نہیں کہ ہر جنگ لڑی جائے۔ ہر شخص آپ کی وضاحت کا مستحق نہیں ہے۔ بعض اوقات، سب سے مضبوط چیز جو آپ کر سکتے ہیں وہ ہے چلے جانا۔ اس لیے نہیں کہ آپ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے، بلکہ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ کچھ لوگ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

☆☆☆

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔۔۔!

(یہ کالم میرے سوشل میڈیا اکاؤنٹس بند کرنے کے تناظر میں لکھا گیا۔)

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ۔۔۔!" برطانوی سیاستدان جان وِلکس (John Wilkes) 18ویں صدی کے ایک برطانوی صحافی، سیاستدان اور آزادیٔ اظہار کے حامی تھے۔ وہ شاہی حکومت کے سخت ناقد تھے اور اپنے اخبار "The North Briton" میں حکومت پر کڑی تنقید کرتے تھے۔

1763 میں، انہوں نے "North Briton, Issue No. 45"، میں شاہی تقریر پر شدید تنقید کی، جس پر انہیں ملک سے غداری کا مرتکب قرار دیا گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ تاہم، قانونی جنگ کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔

جب وہ تقریباً تین ماہ بعد رہا ہو کر واپس آئے تو اسی مقام پر کھڑے ہو کر اپنی تقریر وہیں سے جاری رکھی جہاں سے وہ گرفتار ہوئے تھے۔

یہ واقعہ آزادیٔ اظہار کی علامت بن گیا اور آج بھی اسے آزادیٔ صحافت اور جمہوریت کی جیت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا" کہ گزشتہ سے پیوستہ روز مجھ جیسے بے ضرر سے لکھاری کا فیس بک اکاؤنٹ "اُن" کی ایما اور رپورٹ پر بند کر دیا گیا ہے۔ جبکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی کہ میری اس "نقار خانے" میں کون سنتا ہے۔ میں تو صرف اپنے کتھارسس کے لیے سوشل میڈیا اور مختلف اخبارات 1992 سے لکھ رہا ہوں۔ اور میرے نہ لکھنے یا سوشل میڈیا بند ہو جانے سے یہ تو ہونے سے رہا کہ راوی چین لکھنا شروع کر دے گا یا اگر حسن ایوب، رضی دادا اور انصار عباسی جیسے چین کی بانسری بجا تو رہے ہیں لیکن اثر پذیر نہیں ہے۔

چونکہ اس ملک کا نوجوان نہ صرف بدل گیا ہے بلکہ باشعور بھی ہو گیا ہے۔

پاکستان میں کبھی بھی مکمل طور پر آزادانہ و منصفانہ الیکشن نہیں ہوئے لیکن جس قدر بدترین اور غیر منصفانہ الیکشن 8 فروری 2024 کو کروائے گئے اس کی مثال شاید دنیا میں بھی کم کم ملے گی۔ اس سے پہلے جس بھونڈے طریقے سے رجیم چینج کی گئی، اور پھر جس طرح کی نگران حکومت قوم پر مسلط کی گئی اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ:

جہاں ایک سیاسی جماعت سے انتخابی نشان چھین لیا ہو۔

جہاں اس جماعت کے مقابلے میں سیاسی جماعت بنائی گئی ہو۔

جہاں چادر چار دیواری کو پامال کیا گیا ہو۔

جہاں ہزاروں عورتوں اور مردوں کو گرفتار کیا گیا ہو۔

جہاں سرکاری میڈیا (یاد رہے پیمرا کے نیچے آنے والے چینل بھی موجودہ دور میں سرکاری چینل ہی ہیں) کی بھی زبان بندی کر دی گئی ہو۔

جہاں روز اینکرز آف ائیر کر دیئے جاتے ہوں۔

جہاں ایکس بند اور دیگر سوشل میڈیا پر بے جا پابندیاں ہوں۔

جہاں آئین اور قانون ناپید ہو گئے ہوں۔

جہاں عدالت میں بینچ بنانے تک کا اختیار حکومت کے پاس ہو۔

جہاں عدت جیسے بے ہودہ کیسز بنائے جاتے ہوں۔

جہاں مہنگائی ناقابل برداشت ہو چکی ہو۔

جہاں امن و امان کی صورتحال بدترین ہو چکی ہو۔

جہاں اظہار رائے اور پُرامن احتجاج کے راستے بند کیے جا چکے ہوں۔

جہاں فردِ واحد یا مخصوص جماعت کے لیے قانون سازی کی جاتی ہو۔

جہاں سرمایہ کاری کم و بیش صفر ہو چکی ہو۔

جہاں 65 فیصد نوجوان اپنا ملک چھوڑ کر جانا چاہتے ہوں۔

جہاں سانس لینا دشوار ہو چکا ہو۔

وہاں جھنجلاہٹ نہ ہو؟ وہاں بے چینی نہ ہو؟ وہاں فرسٹریشن نہ ہو؟

تو اے میری عزیز مقتدرہ، اے میرے ملک کے مالکان براہِ کرم قوم کو بولنے تو دیں۔
قوم کے بولنے سے، احتجاج سے آپ کی پرواز میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔
قرۃ العین حیدر برصغیر کی ایک مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس تھیں۔ وہ 1947 کے بعد پاکستان آگئی تھیں لیکن کچھ عرصہ بعد واپس بھارت چلی گئیں۔ ان کے بھارت واپس جانے پر پاکستان میں بہت بحث ہوئی، کہا جاتا ہے کہ جب ایک پاکستانی صحافی نے ان سے پوچھا کہ "آپ پاکستان چھوڑ کر واپس بھارت کیوں چلی گئیں؟"
تو انہوں نے جواب دیا:
"وہاں بھونکنے نہیں دیتے۔"
یہ جملہ در حقیقت ایک علامتی طنز تھا،
قراۃ العین حیدر کا مشہور ناول "آگ کا دریا" جب پاکستان میں شائع ہوا تو اس پر تنقید کی گئی کہ یہ پاکستان کے بیانیے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کئی نقادوں نے انہیں پاکستان کے نظریئے کے خلاف لکھنے پر آڑے ہاتھوں لیا۔
بد قسمتی سے آج بھی ہمارا نظریہ اور قومی بیانیہ اتنا ہی نازک اور غیر حقیقی ہے کہ اظہار رائے کو روکنا پڑتا ہے۔
8 فروری کرنا پڑتا ہے۔
فارم 45 کو فارم 47 سے بدلنا پڑتا ہے۔
عدالت کو گاوں کی پنچائیت سے بھی زیادہ بدتر کرنا پڑتا ہے۔
غیر حقیقی سیاسی قوتوں کو مسلط کرنا پڑتا ہے۔
لیکن زمانے کی حرکات بدل چکیں۔ سوشل میڈیا اور اے آئی کے زمانے میں شعور کا جن بوتل سے باہر آچکا۔ جلد یا بدیر پاکستان ایک مہذب جمہوری اور انسان دوست ملک بن کر رہے گا۔

☆☆☆

کتے بلوں کو ہانڈی نہ سونگھنے دیں!

ہمارے گاؤں میں ایک شخص "ماما" ہوتا تھا، اسکا جب بھی کچھ اچھی چیز کھانے کو دل کرتا، خصوصاً صبح سویرے "پراٹھا چائے" تو چند گھروں میں اسکا آنا جانا تھا۔ صبح صبح کسی گھر میں جاتا تو جھاڑو دیتی عورت کو دور سے کہتا ---

"نیک بخت! تم نے ساری زندگی محنت میں گزار دی، میں نے تیری وہ قدر نہیں دیکھی جو ہونی چاہئے تھی--- یہ گھر کیا تھا تو نے اسے کیا بنا دیا.. تیرا ہی جگرا ہے۔"

پھر اسکے خاوند سے کہتا:

"اوئے اس کی قدر کیا کر، تمہیں ایسی عورت نصیب ہوئی۔"

پھر وہ خاتون خاوند کی شکایتوں کے انبار لگاتی، "ماما" ماتھے پر ہاتھ رکھ کر افسوس کرتا--- خاتون ہاتھ دھو کر آجاتی اور پوچھتی:

"چائے پئیں گے؟"

وہ جواب دیتا:

"صرف چائے، تیرے ہاتھوں کے لذیذ پراٹھے یاد ہیں لیکن اب تم تھکی ہو اچھا نہیں لگتا۔" اور پھر وہ تعریفوں کی ہوا پر اڑتی خاتون دو چار پراٹھے اور بڑا مگ چائے کا لے آتی--- اور "ماما" چند منٹوں میں سب چٹ کر جاتا، چادر جھاڑتا اور نکل جاتا---

موقع کے گواہ کہتے ہیں کہ ان دو پراٹھوں کی وجہ سے دو دو ماہ، دو دو سال ان گھروں میں لڑائی جھگڑے اور فساد چلتا رہتا۔

بدقسمتی سے ہمیں اچھے پڑھے لکھے خاندانوں میں بھی ایسے "مامے" "ٹکرے--- ہوتے ہیں۔

شادی ہونا گھر بسانا، ایک نسل ایک خاندان کو آگے لے کر چلنا، بچوں کی پیدائش سے لے کر، پڑھائی، روزگار، شادیوں، پوتوں نواسوں تک ---ایک مسلسل تگ ودو، زندگی سے بھرپور کہانی ایک گھر کے ارد گرد چل رہی ہوتی ہے۔

کوئی بھی ایک کنبہ جانتا ہے کہ زندگی گزارتے گزارتے، کتنی مشکلات، پیچید گیاں، مسائل، پریشانیاں بھی آتی ہیں، زندگی یونہی نہیں گزر جاتی ---کوئی امیر ہے یا غریب مسائل زندگی کا حصہ ہیں۔

شادی کے بعد خاوند بیوی، اکٹھے رہ کر، محبت سے پہاڑ جتنی مشکلات بھی حل کر لیتے ہیں، ہزار قسم کی محرومیوں پر، خوش اسلوبی سے پردہ ڈال کر، دنیا کے سامنے ہنستے مسکراتے، اپنی ستر پوشی اور بھلے مانسی کا بھرم بخوبی نبھالیتے ہیں---

لیکن بد قسمتی سے ہمارے قریبی رشتوں میں بھی کچھ ایسے لعنتی کردار، موجود ہوتے ہیں جو "دو پراٹھوں کیلئے" ایک وقت کی چائے کیلئے یا چند لمحوں کے زبان کے چسکوں کیلئے، گھروں کی دیواروں میں دراڑیں ڈال جاتے ہیں--- وقتی فائدہ، ہمدرد نظر آنے کا ڈرامہ، کمزور انسانی ذہنوں کو بگاڑنے کی یہ پریکٹس، اچھے خاصے پڑھے لکھے کر رہے ہیں--- رشتوں کے روپ میں چھپے یہ ایسے "سور" ہوتے ہیں جو آپکی فصلیں اور نسلیں برباد کر جاتے ہیں۔

یہ سور، سوٹڈ بوٹڈ، قیمتی گاڑی، قریبی رشتے، چہروں پر مسکراہٹ سجائے آتے ہیں، ہنستے مسکراتے نکل جاتے ہیں لیکن چند ہفتوں مہینوں یا سالوں میں، آپکو احساس ضرور ہوتا ہے کہ ہماری زمین پھر سے بنجر ہو چکی ہے، لیکن یہ احساس اتنی خرابیاں چھوڑ جاتا ہے کہ اسکا ازالہ ممکن نہیں ہوتا، اور ایک ہنستے بستے گھر میں غلط فہمیوں اور مسائل کا کیڑا اگلی نسل تک منتقل ہو جاتا ہے---

ہماری بد قسمتی یہ بھی ہے کہ ہم سچ کی اصل جگہ پر، سچ نہیں بولتے، "صاف بات کو بد تمیزی" کا درجہ دیتے ہیں۔ منافقت ہمارے اندر سرایت کر چکی ہے---اور ہماری یہی کمزوریاں ہمارے خاندانی نظام کو پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا کیے ہیں۔

ہم مغرب کی مثالیں دیتے ہیں لیکن نہ ہم مکمل مغرب کی پیروی کرتے ہیں۔ ہم سارا سارا دن مذہب کی بحث کرتے ہیں لیکن اسلام پر عمل سے گریز ہماری سرشت میں شامل ہو گیا ہے---کوئی اس مسلے کی سنجیدگی کو سمجھے نہ سمجھے، میرا ذاتی تجربہ ہے، سینکڑوں مثالیں

میرے ارد گرد موجود ہیں۔ ہماری تھوڑی سی غیر سنجیدگی اور لاپرواہی ہمیں پوری کی پوری محنت سے پکائی ہانڈی، باہر پھینکنے پر مجبور کر دیتی ہے کیوں کہ ہم بروقت "کتوں بلوں" کو کچن اور پھر ہانڈی میں منہ مارنے، سے پہلے روک نہیں پاتے۔

چاہے تمہاری محبت ان لوگوں کے لیے کتنی ہی گہری ہو، یہ بہت ضروری ہے کہ تمہارے اور ہر شخص کے درمیان ایک حفاظتی فاصلہ ہو جو تمہیں دلوں کی تبدیلیوں اور مایوسیوں سے بچائے۔

☆☆☆

توبہ

(چھوٹا منہ بڑی بات، استادِ محترم جناب پروفیسر احمد رفیق اختر کی نظر کرم سے)

"اچھا تم بتاؤ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سب سے بڑا تحفہ کیا دیا تھا؟"

وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھا، میں سوچ میں پڑ گیا، وہ اس دوران میری طرف دیکھتے رہے، میں نے تھوڑی دیر سوچا اور عرض کیا:

"شعور"

انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا، میں نے عرض کیا

"عقل"

وہ فوراً بولے:

"شعور اور عقل دونوں ایک ہی چیز ہیں"

میں نے مزید سوچا اور عرض کیا:

"آکسیجن، سورج کی روشنی، پانی، خوراک اور جمالیاتی حِس"

انہوں نے نہ میں گردن ہلا دی، میں نے عرض کیا:

"تعمیر کا فن، انسان کائنات کی واحد مخلوق ہے جو پتھروں کو ہیرے کی شکل دے سکتی ہے، جو مٹی کا محل بنا سکتا ہے اور جو ریت کے ذروں کو شیشے میں ڈھال سکتا ہے۔"

وہ مسکرائے اور انکار میں سر ہلا دیا، میں نے اس کے بعد انسان کی تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کا نام لینا شروع کر دیا لیکن وہ انکار میں سر ہلاتے رہے یہاں تک کہ میں تھک گیا اور بے بسی سے ان کی طرف دیکھنے لگا، وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے:

"آپ نے انسان کی جن خوبیوں اور صلاحیتوں کا ذکر کیا وہ تمام اللہ تعالیٰ کی دین ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے یہ خوبیاں قائم اور دائم رہتی ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے تو انسان فرعون ہو یا نمرود یا باراک حسین اوبامہ اس کی خوبیاں اس کی خامیاں بن جاتی ہیں اور وہ دنیا میں زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔"

میں خاموشی سے سننے لگا، وہ بولے:

"میں آپ کو اب اس سب سے بڑے تحفے کے بارے میں بتاتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا، وہ بولے:

"قدرت نے انسان کو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے، دنیا کی کوئی دوسری مخلوق، کوئی خاکی یا نوری پیکر اس خوبی کی مالک نہیں"

میں نے حیرت سے پوچھا:

"جناب میں آپ کی بات نہیں سمجھا" !

وہ بولے:

"مثلاً تم چاند کو لے لو، اللہ تعالیٰ نے جب کائنات بنائی تو اس نے چاند میں ایک پروگرام فیڈ کر دیا اور چاند اب اس پروگرام کے تحت چمک رہا ہے اور جب تک قدرت پروگرام نہیں بدلے گی یہ چاند اسی طرح چمکتا رہے گا، آپ سورج، ستاروں اور سیاروں کو لے لیجئے، زمین کی حرکت کو لیجئے، ہواؤں، فضاؤں، ندیوں اور نالوں کو لے لیجئے، دریاؤں، سمندروں اور پہاڑوں کو لے لیجئے، زلزلوں، طوفانوں اور سیلابوں کو لے لیجئے، یہ تمام ایک پروگرام کے تحت چل رہے ہیں اور قدرت یہ پروگرام فیڈ کر کے ان سے لاتعلق ہو گئی۔" وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا:

"جناب میں اب بھی آپ کا نکتہ نہیں سمجھ سکا"!

وہ بولے:

"دنیا کا کوئی پہاڑ، کوئی درخت، کوئی جانور، کوئی ستارہ اور کوئی سیارہ اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکتا لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس خوبی سے نواز رکھا ہے کہ وہ اپنے ربّ کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے، وہ اسے راضی کر سکتا ہے۔"

میں نے عرض کیا:

"جناب میں یہی تو آپ سے پوچھ رہا ہوں۔"

وہ مسکرائے اور بولے:

"لیکن اس نکتے کو سمجھنے کے لئے مجھے پیچھے تاریخ میں جانا پڑے گا۔"

میں خاموشی سے سننے لگا، وہ بولے:

"آپ شیطان اور حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ دیکھئے، اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا وہ انسان کو سجدہ کرے، شیطان نے حکم عدولی کی، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوئے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ کر دیا، شیطان آسمانوں سے اترا اور کروڑوں سال سے زمین پر خوار ہو رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو گندم کا دانہ چکھنے سے منع فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی، اللہ تعالیٰ ان سے بھی ناراض ہوئے اور انہیں بھی آسمان سے زمین پر بھیج دیا لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے رویے اور شیطان کے رویئے میں بڑا فرق تھا۔"

وہ دم لینے کے لئے رُکے اور دوبارہ گویا ہوئے:

"شیطان زمین پر آنے کے باوجود اپنی بات پر اڑا رہا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے لگے، وہ سجدے میں پڑے رہتے تھے، روتے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہی، اپنی غلطی، اپنے جرم اور اپنے گناہ کی معافی مانگتے جاتے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول نہ کر لی اور مشیتِ ایزدی ان سے راضی نہ ہو گئی۔" وہ خاموش ہو گئے۔

ہمارے درمیان خاموشی کے بے شمار پل گزر گئے، جب یہ وقفہ طویل ہو گیا تو میں نے عرض کیا:

"جناب میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھا۔"

وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے:

"اللہ تعالیٰ کا انسان کے لئے سب سے بڑا انعام توبہ ہے، انسان اس انعام، اس تحفے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات کو راضی کر سکتا ہے اور وہ اللہ جو اپنے بندے کی کسی خطا، کسی جرم، کسی کوتاہی اور کسی گناہ سے ناراض ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے مان جاتا ہے اور اس بندے پر اپنے رحم، اپنے کرم اور اپنی محبت کے دروازے کھول دیتا ہے اور یوں انسان سکون میں چلا جاتا ہے۔"

☆☆☆

اللہ کی محبت

فیض یا عطا کیا ہے اور بہترین مسلمان بننے کیلئے یا روحانی سفر کیلئے فیض یا عطا کتنی ضروری ہے؟

ہر که خواہی ہم نشینی با خدا
اُو نشیند صحبتِ با اولیاء

جو کوئی اللہ تعالی کی قربت چاہتا ہے اُسے چاہئے کہ وہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کرے۔ کسی اللہ کے ولیِ کامل کی آپ کی طرف توجہ فیض ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ مرشد (جسے استاد، رہبر یا کوئی بھی نام دے لیں سب ادب رہے) اور مرید (یا شاگرد) کے قلب کے جُڑ جانے کا نام اور ولی اللہ کی شفقت و مہربانی کا نام فیض ہے، جن سے آپ کو فیض کی طلب ہو ان کی طرف سے آپ کو صحیح معنوں میں ایک بہترین مسلمان بننے یا سالک و طالب کے روحانی سفر کو آگے بڑھانے کے لیے مدد، روحانی پاور اور راہنمائی عطا کی جاتی ہے تا کہ آپ کا سفر بہترین انداز میں آگے بڑھ سکے۔

کسی بھی ولی اللہ سے فیض پانے کا مقصد خالصتاً اللہ کی محبت و رضا اور معرفت و قربِ الٰہی ہوتا ہے اور پیارے رسول خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے عشق میں ان کی اتباع میں آگے بڑھنا مقصود ہو۔ اور پھر آپ کا اس ولی اللہ سے یا مرشد سے ایسا تعلق ہو جو کسی اور سے نہ ہو، دل میں ایک خاص شدت والی محبت ہو. وہی محبت آپ کو فیض کے قریب کرتی ہے۔

فیض سے مراد رنگ چڑھنا بھی ہے، اگر کسی پہ کسی کا رنگ چڑھ رہا ہے تو یقیناً یہ فیض ہے، طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا تبدیل ہونا فیض ہے۔ اور ایسا تب ممکن ہوتا ہے جب ہم اس ہستی کی محبت میں ڈوب کر اندر سے خالص ہو کر اس کی کی تعلیمات اور سیرت کو اپناتے ہیں۔

سالک و طالب یا عاشق کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مرشد کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھے، ان کے احکامات کو بجا لائے اور ان کی سیرت کو اپنائے، زیادہ سے زیادہ مرشد کی ظاہری حاضری بھی دے اور باطنی طور پہ بھی توجہ ان کی طرف رکھے، کیونکہ مرشد وہ عظیم ہستی ہوتی ہے جو کہ طلب گار کو منزلِ مقصود پر پہنچاتی ہے، اللہ کریم کی پہچان اور معرفت کرواتی ہے، وحدانیت کا جام پلاتی ہے۔ حضور نبی پاک صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے عشق اور فیضان سے مالا مال کرتی ہے، دل میں حُبِّ آقا کریم صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ و آلِ رسولِ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی شمع روشن کرتی ہے، اور ان کی پاک و برتر کچہری تک پہنچاتی ہے۔

☆☆☆

ووٹ کیوں اور کس کے لیے ؟

مملکتِ خداداد پاکستان کے بانی قائد اعظم محمد علی جناح معمار پاکستان سو فیصد جمہوریت پسند تھے۔ مگر بد قسمتی سے ان کے بنائے ملک میں ہی جمہوریت آج تک نہیں پنپ سکی۔ تین دہائیوں تک تو فوجی آمر بر سرِ اقتدار رہے اور باقی عرصہ پسِ چلمن امورِ سلطنت کو اپنے ہاتھوں میں رکھا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے بلکہ آج کل تو مبینہ طور پر "سوا نیزے" پر ہے۔ گزشتہ برس اوائل مارچ میں عدم اعتماد سے شروع ہونے والی انار کی ختم ہونے میں نہیں آرہی۔ جس کی وجوہات کا بیان اور مضمرات آج کا موضوع نہیں ہے۔

طویل اور غیر آئینی نگران حکومتوں اور سر پرستوں نے بالآخر فروری کو انتخابات کروانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ باوجود اس امر کے جس طرح کے انتخابات انعقاد پذیر ہیں اس کے نتائج میں خیر تلاش کرنا عبث ہے پھر بھی ووٹ کے ذریعے بننے والے ملک کی معصوم اور "بچاری و بے نوا" عوام کے پاس ووٹ ہی ممکن حد تک کتھارسس کا ذریعہ ہے۔

کسی طرح کا انقلاب تو قوم کے خمیر میں ہی نہیں ہے۔ اس لیے ووٹ کو ہی ہتھیار بنایا جا سکتا ہے۔ بھلے 8 فروری جیسے شدید متنازع الیکشن ہی کیوں نہ ہوں۔ 8 فروری کو الیکشن کا طبل بجنے کو ہے اور موسم سرما کی شدت کے باوجود کسی قدر سیاسی گرما گرمی بھی پیدا ہو رہی ہے۔ ساتھ ساتھ اس بحث کا بازار بھی گرم ہے کہ ووٹ کو عزت دینا زیادہ ضروری ہے یا ووٹر کو؟

عوامی نمائندے آستین چڑھائے، تازہ دم ہو کر عوامی میدان میں اتر گئے ہیں۔ بے روز گاری اور مہنگائی کو جڑ سے ختم کرنے بجلی، (بعض نابغوں جن میں بلاول بھٹو، مریم نواز اور جہانگیر ترین پیش پیش ہیں نے تو 300 یونٹ بجلی فری کرنے کی بھی نوید سنائی ہے)، پانی، گیس گھر گھر تک پہنچانے، علاج اور تعلیم مفت فراہم کرنے کے سہانے خوابوں کی پٹاریاں کھول

دی گئی ہیں۔ اپنی نیک نیتی کو ثابت کرنے کے لیے بعض نیک دل تو اپنی جیبوں سے فلاحی کام کروا رہے ہیں جیت گئے تو ہماری جیبوں سے نکال لیں گے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عوامی نمائندے گزشتہ انتخابات میں منتخب ہوتے ہی "دوسری دنیا" پدھار گئے تھے، اب نئے انتخابات سے قبل انہیں اچانک یاد آیا کہ ان کے ووٹرز مشکل میں ہیں۔

ہر سیاسی جماعت کے نمائندے کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس عوام کے تمام مسائل کا حل ہے، لہٰذا ووٹ انہیں ہی دیا جائے کیونکہ وہ منتخب ہو کر چٹکی بجاتے ہی تمام مسائل کا فوری حل نکال لیں گے۔ جبکہ عوام اپنی تقدیر پر حیران و پریشان ہیں کہ ان کے ساتھ یہ مشق کب تک دہرائی جاتی رہے گی؟ کب تک انہیں ووٹ کے تقدس کے نام پر لوٹا جاتا رہے گا؟ منتخب نمائندوں کی جانب سے مسلسل وعدہ خلافیاں، محض کھوکھلے نعروں اور دعوؤں کی وجہ سے آج عوام کی نظر میں ووٹ کی اہمیت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ لوگ انتخابی عمل میں صرف روایتی طور پر شرکت کرتے ہیں۔ سیاستدان بھی جانتے ہیں کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہے، اس لیے وہ ہر بار نئے اور خوشنما دعوؤں کی دکان سجاتے، وعدوں کا نیا جال بُنتے اور عوام کو اُس میں پھنسا لیتے ہیں۔

ہمارے ہاں سیاسی رہنماؤں کا حافظہ الیکشن جیتتے ہی کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ جبکہ انتخابات قریب آتے ہی ان کی یادداشت لوٹ آتی ہے۔ وہ دوبارہ سے 5 سال قبل کیے گئے دعوؤں پر نیا میدان مارنے کی تیاری میں "جُت" جاتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس عوام کا حافظہ بہت کمزور ہے، وہ پرانے کو بھول کر نئے راگ پر اعتبار کر لیتے ہیں اور نتیجے میں پھر وہی دیرینہ مسائل کا انبار ہوتا ہے اور ان کے ناتواں کاندھے۔

لیکن اب بہت ہو گیا، 8 دہائیوں میں لوگوں کے مسائل کوہ ہمالیہ سے بڑھ چکے ہیں۔ اب عوام کو اپنی سوچ بدلنا ہو گی۔ انہیں اپنے ووٹ کی طاقت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہونا چاہیے، ان کے ووٹ کا ہونا ووٹ کے ذریعے بہت کچھ بدل سکتا ہے، عوام کو اپنے ووٹ کی عزت خود کروانا ہو گی۔ لوگوں کو اب سمجھنا ہو گا کہ الیکشن کا چاند بن کر آپ کے علاقے یا محلے میں نظر آنے والے امیدوار سے بھرپور انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ ووٹ دینے سے پہلے انہیں وہ وعدے اور دعوے یاد کروانے ہوں گے جو پچھلے انتخابات سے قبل کیے گئے تھے۔ ان برسوں میں اپنی محرومیوں کا جائزہ لیں، در پیش

مشکلات اور پریشانیوں پر ایک نگاہ ڈالیں اور یوم انتخاب پر اس نام نہاد نمائندوں کو اپنے ووٹ کے ذریعے یکسر مسترد کر دیں۔ بس یہی آپ کا انتقام ہو گا۔

عوام کو رائے دہی کے وقت کسی دباؤ، رنگ نسل، برادری کی بنیاد کے بجائے قابلیت اور اہلیت کی بنیاد پر نمائندے چننا ہوں گے۔ ایسے لوگ لانے ہوں تھے جو عوام الناس کی حقیقی نمائندگی کر سکیں، جن کے پاس عوامی مسائل کا ٹھوس حل موجود ہو، جن کا منشور الفاظ کے گورکھ دھندوں کے بجائے قابلِ عمل حکمت عملی کا غماز ہو۔

تعلیم یافتہ معاشروں میں عوام کو بخوبی احساس ہوتا ہے کہ ان کا ووٹ ملک کے لیے کتنا اہم ہے، ان کی ذراسی غفلت کتنے بھیانک نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔ بلاشبہ بہترین طرزِ حکمرانی اور جمہوریت ہی عوام کے تمام مسائل کا حل ہے۔ سسٹم کو گالیاں دینے، اسے کوسنے کے بجائے سسٹم کو مؤثر اور فعال بنائیں، جمہوری نظام میں جو خامیاں ہیں انہیں دور کرنے کے لیے ہر پاکستانی اپنا کردار ادا کرے، استعمال ہونے کے بجائے اپنے ووٹ کا درست استعمال کریں۔ یقین کیجیے حالات بدلیں گے، بس تھوڑا خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

یہ درست ہے کہ جمہوریت بہترین انتظام ہے لیکن اسے اپنے لیے انتقام مت بننے دیں۔ ووٹ صرف اس جماعت یا امیدوار کو دیجیے جو بتدریج ملک کو جمہوری، فلاحی اور آئینی مملکت بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ جن کے منشور میں اداروں کو طاقتور اور اپنے "کینڈے" میں رکھنے کا عزم موجود ہے۔

ووٹ انہیں دیجیے جنہوں نے سیاسی جماعتوں کو اپنے گھر کی لونڈی اور کارکنوں کو غلام نہیں بنا رکھا۔ 8 فروری کو ووٹ ضرور دیجیے۔

☆☆☆

ہیپی ویلنٹائن ڈے یا یوم حیا

ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے ہمارے ہاں تین مختلف قسم کے ردِ عمل موجود ہیں۔ کچھ لوگ اس کے حق میں ہیں، اسے پروموٹ کرتے اور اس کے لئے دلائل دیتے ہیں، چونکہ اس معاملے میں "کارپوریٹ" معاملات شامل ہیں۔ بعض پراڈکٹس ویلنٹائن کے حوالے سے فروخت ہوتی ہیں، اس لیے "کنزیومرازم" بھی ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ ویلنٹائن ڈے کی پروڈکٹس (چاکلیٹ، پھول، ٹیڈی بیئر وغیرہ) کی فروخت سے جن کے مفادات وابستہ ہیں، ان کی حمایت کی وجہ سمجھ بھی آتی ہے، مگر ویلنٹائن کو نظریاتی اور فکری بنیادوں پر سپورٹ فراہم کرنے والا حلقہ بنیادی طور پر یا تو عیش پرست ہے جو موج مستی کرنا پسند کرتے ہیں یا پھر یہ لبرل عناصر ہیں، جو فرد کی آزادی کے داعی ہیں۔ جس کا جو جی چاہے، وہ کرے، کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔ ادھر ویلنٹائن کی مخالفت کرنے والے حلقے میں روایتی مذہبی لوگوں کے علاوہ لوئر مڈل کلاس کی روایتی اخلاقیات والے لوگ شامل ہیں، جن کے خیال میں اپنی مشرقی اور اسلامی اقدار کی حفاظت کرتے ہوئے ہمیں اپنے بچوں کو مغرب کی تہذیبی یلغار سے بچانا چاہیے۔

ویلنٹائن ڈے کی حمایت میں تین چار دلائل دیئے جاتے ہیں:

"یہ محبت کے اظہار کا دن ہے، اس پر پابندی کیوں لگائی جائے ؟ انسانی زندگیوں میں نفرتیں اس قدر زیادہ ہو چکی ہیں، اگر ایک دن محبت کے نام کر دیا گیا ہے تو اس میں کیا برائی ہے ؟نوجوان لوگ کچھ دیر کے لئے خوش ہو جائیں، کچھ ہنس کھیل لیں تو کون سی قیامت آجائے گی، مولوی حضرات کسی کو خوش دیکھ نہیں سکتے۔۔وغیرہ وغیرہ۔"

ایک اور دلیل جو عام طور سے دی جاتی ہے:

”ویلنٹائن ڈے صرف لڑکے اور لڑکی کی محبت کا دن نہیں ہے، محبت کا صرف یہی رنگ تو نہیں، ماں، باپ، بھائیوں وغیرہ کو بھی پھول دیئے جا سکتے ہیں۔ پُر خلوص محبت کا اظہار ہی ہے، ایک دن مقرر ہو گیا ہے تو اسے منانے میں کیا حرج ہو سکتا ہے؟“

بعض لوگ اس الزام پر برہم ہو جاتے ہیں کہ ویلنٹائن ڈے مغرب سے درآمد شدہ تہوار ہے، جھنجھلاہٹ میں یہ ایک ہی فقرہ دہراتے ہیں:

”ویلنٹائن مغرب سے آیا ہے تو پھر کیا ہوا؟ اس میں کیا حرج ہے۔۔۔؟“

ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے کوئی حتمی رائے قائم سے پہلے دو تین باتیں سمجھ لی جائیں۔ سب سے اہم یہ کہ ہر تہوار یا دن کا ایک خاص پس منظر ہوتا(ImpactOveral) اور ایک مجموعی تاثر ہے۔ اس مخصوص پس منظر ہی میں ایسے دیکھنا پڑے گا، یہ ممکن نہیں کہ آپ اس کے کسی ضمنی اثر (Side Effect) کو قبول کر لیں اور صرف اس کی بنیاد پر رائے قائم کر لیں۔

مثال کے طور پر روزے ہم اللہ کے حکم کی تعمیل میں رکھتے ہیں اور یہ ایک طرح سے تذکیہ نفس کا طریقہ ہے۔ اس کے ضمنی فوائد بے شمار ہو سکتے ہیں، بعض ماہرین اس کے طبی فوائد بھی گنواتے ہیں۔ یہ ثانوی اثرات یا فوائد خواہ جس قدر ہو جائیں، مگر روزے کا بنیادی سبب جو ہے، وہی رہے گا۔ ایسا نہیں کہ کوئی سمارٹ ہونے کے لئے روزے رکھنے شروع کر دے، ایسا کرنا ہرگز عبادت نہیں کہلائے گا۔

یہی بات نماز کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ اللہ کا حکم ہے، ہمیں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے یہ سکھایا اور اس کے اجر سے متعارف کرایا۔ اب نماز پڑھنے کے ضمنی اثرات کئی ہوں گے، بعض سکالر اس میں ورزش کے پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہیں، تو کچھ اسے ذہنی سکون کا نسخہ تصور کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ نماز مگر نماز ہی رہے گی اللہ کی بندگی کا ایک اسلوب نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق۔ اس کا مجموعی تاثر بھی وہی رہے گا، اس سے یہ عبادت پہچانی جاتی ہے۔

تہوار کی بات چل رہی ہے تو عید کو لے لیں۔ عید الفطر انعام ہے رمضان المبارک کی عبادت کا، اس دن کو اسی پس منظر میں دیکھا اور جانا جاتا ہے۔ عید الضحیٰ میں قربانی کی سنت پوری کی جاتی ہے۔ تاریخی پس منظر ہے، جس سے اس دن کو پہچانا جاتا ہے۔

ویلنٹائن ڈے کا ایک پس منظر ہے، مغربی تاریخ میں کچھ روایات ہیں اور پھر جدید مغربی تاریخ میں اس دن کو منانے کا بدلتا انداز ہے، جس پر اب دو عشروں سے کارپوریٹ روایات اور کنزیومر ازم کا غلبہ ہو چکا۔

ویلنٹائن بنیادی طور پر "پرو نکاح" یا "پرو میرج" تحریک تھی۔ جب ایک خاص زمانے میں بادشاہِ وقت نے نوجوانوں پر شادی کرنے کی پابندی عائد کر دی کہ شادی شدہ لوگ اپنی بیوی بچوں کی محبت میں فوج میں شامل ہونے سے گریز کرنے لگے تھے۔

روایت کے مطابق "سینٹ ویلنٹائن" نے اس ناروا شاہی حکم سے بغاوت کا راستہ نکالا اور نوجوان جوڑوں کی شادیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس جرم میں اسے سزا بھی ہوئی، مگر یہ سلسلہ چل نکلا۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں جب مغرب کی بدلتی اخلاقی قدروں میں شادی کا انسٹی ٹیوشن کمزور پڑنے لگا تو ویلنٹائن ڈے کا انداز بھی بدل دیا گیا۔ اب محبت کرنے والے جوڑوں کے مابین عہد و پیمان اور کھلے اظہار محبت کے لئے اسے استعمال کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس میں کنزیومر ازم کا رنگ بڑھتا گیا۔ اب صرف اظہار کافی نہیں بلکہ سرخ پھول، چاکلیٹ، ٹیڈی بیئر وغیرہ لازم ہو گئے، "ویلنٹائن ڈِنر" روایت ہو گئی اور پھر ویسٹرن مسائل میں "رومانوی شام" منانے بلکہ زیادہ کھلے الفاظ میں "شب بسری" کے تمام لوازمات شامل ہوتے گئے۔

ویلنٹائن ڈے کی مغربی روایت میں اور جو لوگ پاکستان جیسے ملک میں یہ دن رائج کرنا چاہتے ہیں. ان سب پر یہ واضح ہے کہ یہ خالصتاً مرد و عورت کے مابین اظہارِ محبت کا دن ہے۔ یہ اظہار محبت بھی مغربی کلچر سے مستعار یا اخذ کردہ ہے۔ مشرقی ٹیچر اور اسلامی روایات میں جس کی قطعی گنجائش نہیں۔ جس طرح کسی نئ چیز کو معاشرے کے لئے قابل قبول بناتے ہوئے پہلے کچھ تکلفات اور ادب آداب کا لبادہ پہنایا جاتا ہے اسی طرح اس دن کے حوالے سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اسے ماں باپ یا بہن بھائیوں سے محبت کے اظہار کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نہیں جناب، یہ دلیل درست نہیں ہے۔ یہ صرف ایک حیلہ دھوکہ اور تنقید کرنے والوں کا منہ بند کرنے کا حربہ ہے۔

ہمیں اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے اظہار محبت کے لئے غیر اخلاقی، مشکوک پس منظر والے کسی دن کی ضرورت نہیں۔ اوّل تو مقدس رشتوں کے ساتھ اظہار محبت کو الگ دن کی ضرورت نہیں۔ ہمارا مذہب، ہماری روایات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ اپنے ان عزیز

رشتوں کے ساتھ محبت ہمیں ہر لمحہ اپنے دل میں زندہ رکھنی اور اپنے عمل سے اسے ثابت کرنا ہے۔ کسی فرماں بردار اولاد کو اپنی سعادت مندی اور محبت ثابت کرنے کے لئے سرخ پھولوں کی ضرورت نہیں۔ اسے صبح سے شام تک کے عمل سے جھلکنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر خواہ کتنے پیسے پھولوں، چاکلیٹوں پر خرچ کر جائیں، وہ سب بیکار ہیں۔

ایک اور اہم نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ محبت کا جذبہ قدرت کا تحفہ ہے، مرد اور عورت کے درمیان محبت ہونا فطری چیز ہے، مخالف جنس کے لئے کشش رکھنا بھی ایک حقیقت ہے۔ اس کشش، محبت اور تعلق کو دیرپا بنیادوں پر استوار کرنے اور پھر قائم رکھنے کا ایک طریقہ، قرینہ اور سلیقہ ہے۔

ہماری اسلامی اور مشرقی روایات میں مرد اور عورت ایک خاص اسلوب اور طریقے سے رشتے میں بندھتے ہیں۔ ہمارا مذہب اور سماج اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ صرف اسلام کا معاملہ نہیں بلکہ مشرقی تہذیب میں رہنے والے غیر مسلموں کی بھی یہی روایات اور آداب ہیں۔ اس خطے میں رہنے والے ہندو گھرانے ہوں سکھ یا عیسائی، ہر ایک میں بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے، والدین کی رضامندی سے معاملات آگے بڑھائے جاتے اور اپنی محبت کے جذبوں کو نفاست اور شائستگی کا لبادہ پہنا کر مزید خوبصورت بنایا جاتا ہے۔ اپنی انہی روایات کا احترام کرنا چاہیے، ہر معاشرے کے کچھ بنیادی اجزا ہوتے ہیں، سماج کا "فیبرک" جن سے جڑا ہوتا ہے، انہیں ادھیڑنے کی کوشش پورے سماج کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

ویلنٹائن ڈے کی مخالفت کرنے والے جنونی، متشدد یا محبت کے مخالف نہیں۔ ان کے دلوں میں بھی بہاریں آتیں، جذبے مہکتے اور آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں۔ یہ لوگ مگر اپنے جذبات کے کھلے، بے لگام اظہار کو "حیوانی فعل" گردانتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ محبت جیسے حسین ترین جذبے کی توہین نہ کی جائے۔ عامیانہ، کئی اور بازاری انداز سے اس کے اظہار کے بجائے مہذب، شائستہ انداز میں رشتوں کے تقدس اور نزاکتیں ملحوظ خاطر رکھی جائیں۔ خواہشات کی اس انداز میں تکمیلِ محبت کو نہ صرف مقدس اور پاکیزہ بنا دیتی ہے بلکہ ربّ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے سے رحمتیں اور برکات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆

میرا شہر سیالکوٹ

سن 1881 میں سیالکوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترنے والی ''ڈاکٹر ماریا'' ہندوستان کو اپنا دیس بنانے آئی تھیں۔ شہر سے باہر ایک خاموش مقام پر انہوں نے اپنی ڈسپینسری اور خلقِ خدا کی خدمت شروع کر دی۔ ڈسپینسری نے سرجری کا روپ دھارا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک اسپتال بن گیا۔

ایوانِ صنعت و تجارت پہ اندر کی جانب واقع، مشن اسپتال ڈاکٹر ماریا کا ہی خواب ہے۔ ''بٹلر کاؤنٹی'' کی قبر پہ کوئی پھول رکھے، مشن ہسپتال سے شفا پانے والے سینکڑوں مریض روزانہ اپنے اپنے خدا سے ماریا کی مغفرت مانگتے ہیں۔ گفتگو کے دوران ''خ'' کو ''ح'' بولنے والے سیالکوٹ کے لوگ پنجاب بھر میں اپنے منفرد مزاج کی بدولت مشہور ہیں۔ یہ ان جڑواں نہروں کا اثر ہے جو مرالہ سے نکلتی ہیں اور جڑواں بچوں کی طرح دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتی ہیں یا ایک اور ڈیک نالہ کا اعجاز ہے، شہر کے مزاج میں بہر حال دو پانی اکٹھے بہتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں آباد برصغیر کے باسیوں کی طرح یہ شہر بھی ''دوج'' کا شکار ہے۔ آگے بڑھنے کا خواہشمند اور پیچھے رہ جانے کا دلدادہ، ترقی کا معترف اور روائت پر جان دینے والا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر میں پوری دنیا کے فٹبال بنتے ہیں مگر پورا شہر کرکٹ کھیلتا ہے۔

صنعت اور تجارت کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ کہتے ہیں 1895 میں کسی چھاؤنی والے صاحب کا ریکٹ ٹوٹ گیا۔ مرمت کے لئے پردیس بھجوانا ممکن نہیں تھا لہٰذا انہوں نے یہیں کسی کاریگر کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے ریکٹ کے تار بننا شروع ہوئے، پھر فریم اور آہستہ آہستہ ہندوستان بھر کے ''صاحب'' سیالکوٹ کے ریکٹ استعمال کرنے لگے۔ بیسویں صدی

کی پہلی دہائی میں انگریزی لکڑی سے کرکٹ کے بلے بنتے گئے اور 1933 میں سیالکوٹ کے حصے میں پہلا ایکسپورٹ ایوارڈ آیا۔

ایسے ہی مشن ڈسپنسری کے کچھ جراحی کے آلات کُند ہوئے تو مرمت کے لئے شہر آئے، دھیرے دھیرے پورے ہندوستان کے مشن ہسپتال اپنا سامان سیالکوٹ بھجوانے لگے۔ مرمت کا سلسلہ آگے بڑھا تو سامان تیار بھی ہونا شروع ہو گیا۔ پھر مصر، عرب اور افغانستان کے اسپتالوں میں سامان جانے لگا اور اب یہ عالم ہے کہ ایک عالم ان آلات سے شفا پاتا ہے۔

مگر تاریخ اس شہر کا صنعت سے رشتہ اس سے بھی پرانا بتاتی ہے۔ کہتے ہیں "حملہ آوروں" کے ساتھ جب اسلام آیا، دمشق کے "کوفت گر" بھی ساتھ ہی چلے آئے۔ ان کی بنائی ہوئی اینٹیں، اب شہر کی ہر تاریخی عمارت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

امبر کے "راجہ مان سنگھ سوائے" نے شہر والوں کو کاغذ بنانے کا طریقہ سکھایا تو کئی دہائیوں تک مان سکھی کاغذ شہر کی پہچان رہا۔

کھیلوں کے سامان، جراحی کے آلات اور چمڑے کی اشیاء کے علاوہ بھی سیالکوٹ میں بہت کچھ بنتا ہے۔ ٹرنک بازار سے نکلنے والی گلی سیدھی سکاٹ لینڈ جا کر رُکتی ہے۔ ان دو جگہوں کے لیے سات سمندر تو ہیں ہی، ندیم بھٹی کے نام کا پل بھی ہے۔

پائپ بینڈ اور سکاٹ لینڈ کا ثقافتی پر تادا، چار خانوں والی کلٹ، پچھلی چار نسلوں سے اس گلی کی پہچان ہے۔ جنگ میں آگے آگے رہنے والے ان بھٹیوں سے تلوار تو چھوٹ گئی مگر دھات نہیں چھوٹ سکی۔

رومی سپاہ کے خون میں ولولہ پیدا کرنے والی دُھنیں جس پایپ بینڈ سے نکلتی تھیں اب بھی وہ بینڈ جب "اے مرد مجاہد جاگ ذرا" کی دھن بجاتا ہے تو فوج سے برگشتہ دل بھی ایک لمحے کو دھڑکتے ضرور ہیں۔ ندیم بھٹی پائپ بینڈ کا سارا سامان بناتے ہیں، دُھنوں کے اس دھندے کے علاوہ ان کی بنائی ہوئی کلٹ سکاٹ لینڈ میں خاصی مقبول ہے۔

1894 میں شہر میں چھاؤنی بنی نیپئر روڈ والے جنرل نیپئر نے یہ جگہ منتخب کی اور وزیر آباد سے چھاؤنی یہاں منتقل ہو گئی۔ جس طرح مغل بادشاہ، شاہی قلعے، شاہی محلے اور شاہی مسجد سے اپنے اقتدار کی شناخت بناتے تھے، اس طرح انگریز راج نے بھی چھاؤنی، کمپنی باغ اور چرچ تعمیر کر کے ہندوستان پہ اپنے دستخط چھوڑے۔

چھاونی کی ایک سڑک پر دو چرچ بھی موجود ہیں، عین ممکن ہے کہ جس طرح جمعے کے خطبے میں ایک ہی گلی کے دو امام اپنی اپنی مساجد سے "میرے محبوب" کی تکرار بلند کرتے ہوں، اسی طرح ان دو کلیساؤں کے پادری بھی اتوار کے روز "میرے مسیح" کا دعوی کرتے ہوں۔

عجیب بات ہر طور یہ ہے کہ چھاؤنی کے اس چرچ کی تعمیر کا سارا خرچ شیخ مولا بخش نے اٹھایا۔ یہ شیخ مولا بخش کی رواداری تھی یا فوج کی ان کہی خواہش، اس کا ذکر البتہ کہیں نہیں ملتا۔

ٹرنک بازار میں کلدیپ نائر کے والد، ڈاکٹر گور بخش کا کلینک تھا۔ دوسری طرف پیرس روڈ پر بیرسٹر رائے کی کوٹھی تھی، ساتھ میں سیٹھ رائے بہادر کا احاطہ اور پاس میں غلام قادر کی حویلی ان سب سے تھوڑا آگے کوٹیلی پارک کے عالیشان بنگلے۔ ان تمام کوٹھیوں، احاطوں، حویلیوں اور بنگلوں میں اب سرکاری افسران کے گھر ہیں۔ سرونٹ کوارٹروں کے مکینوں کے سواء سب کچھ بدل گیا ہے۔

کوٹھی شیخ نیاز احمد کے ڈرائنگ ہال میں نادر اشیاء ایک شیشے کی الماری میں پڑی ہیں۔ ان میں ایک چینی دان کے اوپر غلام قادر اینڈ سنز لکھا ہے۔ شہر میں ڈھونڈا تو نہ غلام قادر ملے اور نہ ہی سنز۔ پرانے لوگوں سے بات چیت ہوئی تو معلوم پڑا کہ غلام قادر اینڈ سنز، شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا جنرل سٹور ہوا کرتا تھا۔ چھاؤنی کے افسران سے کشمیر کے مہاراجہ تک اور سیالکوٹ کے کلب سے شملہ کے میس تک تمام سامان یہیں سے خریدا جاتا تھا۔

غلام قادر سیالکوٹ کی اتنی مقبول شخصیت تھے کہ جب گھنٹہ گھر کی بنیاد رکھنے کا وقت آیا تو سارے شہر سے صرف دو نام متفقہ طور پر سامنے آئے۔ سیٹھ رائے بہادر اور غلام قادر سن 1980 میں جائیداد کے جھگڑے اتنے بڑھے کہ غلام قادر اینڈ سنز بند ہو گئی۔ کسی کی زندگی کا سرمایہ کسی کی یادوں کے سرمائے کو نگل گیا۔

شہر میں کھیلوں کے سامان کی سب سے بڑی دوکان "اوبرائے اسپورٹس" تھی۔ سردار گنڈا سنگھ کا یہ کاروبار فیکٹریوں سے مزدوروں اور تنخواہوں سے دوکانوں تک، خواجہ حاکم دین سنبھالتے تھے۔ اب گھر گھر سامان بنتا ہے، گلی گلی انٹرنیٹ پہ بکتا ہے اور شہر شہر ڈرائی پورٹ سے روانہ ہوتا ہے۔ اتنے بڑے نیٹ ورک کو نہ گنڈا سنگھ چاہئے اور نہ خواجہ حاکم دین۔

ایک طرف حضرت امام علی الحق کا مزار ہے۔ شیشوں سے مرصع قرانی آیات اور جذب سے سرشار درویش مزار کی فضا کو ایک کیفیت عطا کرتے ہیں۔ سارا دن زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دلچسپ بات مگر یہ ہے کہ اس مرقد پہ زیادہ تر لوگ تشکر کے جذبے سے آتے ہیں تمنا کی کشش سے نہیں۔

کوفت گروں، صنعت کاروں، تاجروں اور سپہ سالاروں کے اس شہر میں ہر طرف مایا داس، مٹی کو سونا بنانے میں مصروف ہیں مگر شہر کے کچھ اور چہرے بھی ہیں۔

جس طرح مشن ہسپتال کی ڈاکٹر ماریا اپنی دواؤں سے لوگوں کے جسم پہ مرہم رکھتی تھیں اسی طرح مرے کالج کی ایک لیکچرار عمیرہ احمد اپنی تحریر سے لوگوں کے دل مندمل کرتی ہیں۔ ایک سیالکوٹ سے جا کر بھی سیالکوٹ سے گئیں نہیں اور دوسری سیالکوٹ میں رہتے ہوئے بھی سیالکوٹ میں نہیں رہتیں۔

ایک بیٹے نے اپنے باپ سے پوچھا کہ:

"دَیا اور وِدیا کا کیا رشتہ ہے۔"

بابا بولے:

"انسان کو دو لوگ فیض پہنچاتے ہیں، شفا دینے والا طبیب اور علم دینے والا استاد۔"

شاید اس لئے زیادہ تر انبیاء طبیب ہو گزرے یا استاد۔۔۔

تاریخی شخصیات میں سے کچھ نام:

مولانا ابراہیم سیالکوٹی، راجہ سل، علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیض، کلدیپ نائر (ادیب و صحافی)، ظہیر عباس (کرکٹر)، امام علی الحق، شہناز شیخ (ہاکی پلئیر)، غلام علی (غزل گلوکار)، سید سبط حسن (شاعر)، پیر سید جماعت علی شاہ، اصغر سودائی (شاعر اور میرے استاد)، گلزاری لال نندا (بھارتی وزیر اعظم)، مشاہد حسین سید، ایس ایم ظفر، زیڈ اے سلہری، عبید اللہ سندھی، عمیرا احمد، وحید مراد، اے کے منگل، دیو آنند، بابرہ شریف، رابندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر شیو کمار بٹالوی، سر ظفر اللہ خاں، راجندر کمار (اداکار)

پس نوشت: تاریخی کوٹھیوں میں سے ایک دیوان بھیج ناتھ کی کوٹھی بھی تھی جہاں قائم مس شاہ اینگلو عریبک سکول میں خاکسار زیر تعلیم رہا۔

☆☆☆

”شہادتِ نہج البلاغ“

آج اس نابغہ روز گار شخصیت کا یوم شہادت ہے جسے راستے سے ہٹانے کے لیے اس وقت کی ”اسٹیبلشمنٹ“ نے اس لمحے کا برسوں انتظار کیا جب علی ابن طالب علیہ السلام ”دُنیا سے لاتعلق اور جھکے ہوئے“ ملیں، جو صرف نماز ہی میں ممکن تھا۔ جب ید اللہ ” دنیا سے بے نیاز اور اللہ کے حضور جھکا ہو“۔

حسنِ حق، واقف اسرارِ جلی یاد آیا
مرکزِ فقر، دو عالم کا ولی یاد آیا!
جب بھی ماہِ رجب صحنِ حرم سے گزرا
مسکراتے ہوئے کعبہ کو علیؑ یاد آیا!

سیدنا زر بن حبیش رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی بن ابی طالب علیہ السلام نے کہا کہ: ”قسم ہے اس کی جس نے دانہ چیرا (پھر اس سے گھاس اگائی) اور جان بنائی، رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ مجھ سے سوائے مومن کے کوئی محبت نہیں رکھے گا اور مجھ سے منافق کے علاوہ اور کوئی شخص دشمنی نہیں رکھے گا۔“ (بخاری، ابو داود)

سیدنا حضرت علی المرتضی علیہ السلام کے فضائل و مناقب اور کردار اور کارناموں سے تاریخ اسلام کے اوراق روشن ہیں جس سے قیامت تک آنے والے لوگ ہدایت و راہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔ حضرت سعد ابن ابی وقاص سے روایت ہے کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ: ”تم میری طرف سے اس مرتبے پر ہو،

جس مرتبے پر حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھے مگر بات یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔"(بخاری و مسلم)

آپ کا نام علی، لقب حیدر و مرتضی، کنیت ابو الحسن اور ابو تراب ہے۔ آپ کا نسب حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کے بہت قریب ہے۔ آپ کے والد ابو طالب اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کے والد ماجد حضرت عبد اللہ دونوں بھائی ہیں، آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد تھیں۔ ماں باپ دونوں طرف سے آپ ہاشمی ہیں۔ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں ہاشمی سرداروں کی تمام خصوصیات موجود اور چہرے سے عیاں تھیں۔ عبادت و ریاضت کے آثار بھی چہرے پر موجود تھے، چہرے پر مسکراہٹ اور پیشانی پر سجدے کے نشان۔ معمولی لباس زیبِ بدن فرماتے، آپ کا عبا اور عمامہ بھی سادہ تھے، گفتگو علم و حکمت اور دانائی سے بھرپور ہوتی۔

بچپن سے نہ صرف حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کے ساتھ رہے، بلکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ ہی کی آغوش محبت میں پرورش پائی۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ نے ان کے ساتھ بالکل فرزند کی طرح معاملہ کیا اور اپنی دامادی کا شرف بھی عطا فرمایا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی خاتون جنت سیدہ حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا کے ساتھ آپ کا نکاح ہوا اور ان سے آپ کی اولاد ہوئی، صحابہ کرام میں جو لوگ اعلیٰ درجے کے فصیح و بلیغ اور اعلیٰ درجے کے خطیب اور شجاعت و بہادری میں سب سے فائق مانے جاتے تھے ان میں آپ کا مقام و مرتبہ بہت نمایاں تھا، خلیفہ چہارم سیدنا حضرت علی المرتضی علیہ السلام میدان جنگ میں تلوار کے دھنی اور مسجد میں زاہد شب بیدار تھے مفتی و قاضی اور علم و عرفان کے سمندر تھے، عزم و حوصلہ میں ضرب المثل، خطابت و ذہانت میں بے مثل۔

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کے چچازاد بھائی اور داماد فضیلتیں بے شمار سخی و فیاض، دوسروں کا دکھ بانٹنے والے، عابد و پرہیز گار، مجاہد و جاں باز ایسے تھے کہ نہ دنیا کو ترک کیا، نہ آخرت سے کنارہ کشی فرمائی، ان سب کے باوجود نہایت سادہ زندگی گزارتے، نمک، کھجور، دودھ، گوشت سے رغبت تھی، غلاموں کو آزاد کرتے، دورِ خلافت میں بازاروں کا چکر لگا کر قیمتوں کی نگرانی فرماتے، گداگری سے لوگوں کو روکتے تھے، جب نماز کا وقت آتا تو آپ کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا اور چہرے پر زردی چھا جاتی، کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

”اس امانت کی ادائیگی کا وقت ہے جسے اللہ تعالی نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر اتارا تو وہ اس بوجھ کو اٹھانے سے عاجز ہو گئے۔“

آپ میں عجز وانکساری نمایاں تھی۔ اپنے عہدِ خلافت میں بازاروں میں تشریف لے جاتے وہاں جو لوگ راستہ بھولے ہوئے ہوتے انہیں راستہ بتاتے، بوجھ اٹھانے والوں کی مدد کرتے، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی آپ میں بہت زیادہ تھی، ایک قبرستان میں بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا:

”اے ابوالحسن! یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟

آپ نے فرمایا:

”میں ان لوگوں کو بہت اچھا ہم نشین پاتا ہوں، یہ کسی کی بدگوئی نہیں کرتے اور آخرت کی یاد دلاتے ہیں۔“

ایک مرتبہ آپ قبرستان تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر قبر والوں کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئے:

”اے قبر والو! اے بوسیدگی والو! اے وحشت و تنہائی والو! کہو کیا خبر ہے، کیا حال ہے؟ ہماری خبر تو یہ ہے کہ تمہارے جانے کے بعد مال تقسیم کر لیے گے اور اولادیں یتیم ہو گئیں بیویوں نے دوسرے شوہر کر لیے۔۔۔ یہ تو ہماری خبر ہے تم بھی اپنی خبر سناؤ!“

اس وقت کمیل آپ کے ہمراہ تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

”اے کمیل، اگر اِن (مُردوں) کو بولنے کی اجازت ہوتی تو یہ جواب دیتے کہ بہترین سامان آخرت پرہیز گاری ہے۔“

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام رونے لگے اور فرمایا:

”اے کمیل، قبر اعمال کا صندوق ہے اور موت کے وقت یہ بات معلوم ہوتی ہے۔“

ضرار اسدی نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوصاف وصفات بیان کرتے ہوئے کہا:

”اللہ کی قسم حضرت علی المرتضی علیہ السلام بڑے طاقت ور تھے۔ فیصلے کی بات کہتے تھے اور انصاف کے ساتھ حکم دیتے علم و حکمت ان کے اطراف سے بہتے، دنیا اور اس کی تازگی سے متوحش ہوتے تھے، رات کی تنہائیوں اور وحشتوں سے اُنس حاصل کرتے تھے،

روتے بہت تھے اور فکر میں زیادہ رہتے تھے، لباس انہیں وہی پسند تھا جو کم قیمت ہو اور کھانا وہی مرغوب تھا جو ادنیٰ درجے کا ہو، ہمارے درمیان بالکل مساویانہ زندگی بسر کرتے تھے اور جب ہم پوچھتے تو جواب دیتے تھے، باوجود یہ کہ ہم ان کے مُقرب تھے مگر ان کی ہیبت کے سبب ان سے بات کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی، وہ ہمیشہ اہلِ دین کی تعظیم کرتے اور مساکین کو اپنے پاس بٹھاتے تھے، کبھی کوئی طاقت ور اپنی طاقت کی وجہ سے ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی امید نہ کر سکتا تھا اور کوئی کمزور ان کے انصاف سے مایوس نہیں ہوتا۔"

ایک موقع پر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

"علی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔"

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ غزوہ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے، ہر معرکے میں سیدنا حضرت علی علیہ السلام نے اپنی شجاعت و بہادری اور فداکاری کا لوہا منوایا بدر و اُحد، خندق و حنین اور خیبر میں اپنی جرات و بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔

ہجرت کی شب حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے بستر مبارک پر آرام فرما ہوئے، اور آپ نے آخری وقت میں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی تیمار داری کے فرائض انجام دیئے اور دیگر صحابہ کرام کے ہمراہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو "غسلِ نبوی" کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

آپ "عشرہ مبشرہ" جیسے خوش نصیب صحابہ کرام میں بھی شامل ہیں، جنہیں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت و خوش خبری دی اور خلافت راشدہ کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے۔

آپ کو بچپن میں قبول اسلام کی سعادت نصیب ہوئی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بعد سب سے پہلے آپ ہی دولت ایمان سے منور ہوئے، آپ کو "السابقون الاوّلون" میں بھی خاص مقام اور درجہ حاصل ہے۔ آپ بیعت رضوان میں شریک ہوئے اور "اصحاب الشجرۃ" کی جماعت میں شامل ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں راضی ہونے اور جنت کی بشارت دی، آپ اصحابِ بدر میں سے بھی ہیں جن کی تمام خطا میں اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیں۔

مکی زندگی میں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے ساتھ ہر قسم کے مصائب و مشکلات کو جھیلتے رہے۔۔۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے آپ کو اپنا "مواخاتی بھائی" بنایا اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے آپ کو اپنے ساتھ وہی نسبت دی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو

حضرت ہارون علیہ السلام سے تھی۔ خلیفہ سوم سید نا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی علیہ السلام تین ماہ کم پانچ سال تک منصبِ خلافت پر متمکن رہنے کے بعد عبد الرحمن بن ملجم خارجی کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد 21 رمضان المبارک کو جامِ شہادت نوش فرما کر شہادت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئے۔

فاروق اعظم رضی اللہ نے فرمایا:

''حضرت علی علیہ السلام کو تین خوبیاں ایسی نصیب ہوئیں، اگر مجھے ان میں ایک بھی مل جاتی تو میرے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہوتیں۔''

1. نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ نے اپنی لختِ جگر سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا ان سے نکاح فرمایا۔
2. نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ نے انہیں مسجد میں سکونت عطا کی۔
3. نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ خیبر میں علم (جھنڈا) انہیں عطا کیا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ نے فرمایا:

''حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ علمِ سنت کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔''

ابن مسعود رضی اللہ نے فرمایا: ''ہم لوگ آپس میں کہا کرتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام اہل مدینہ میں سب سے زیادہ معاملہ فہم ہیں۔''

ابن عباس رضی اللہ نے فرمایا: '' مدینہ منورہ میں فصل قضایا اور علمِ فرائض میں حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہ تھا۔''

☆☆☆

قادیانیت کا مقابلہ

میں نے پوری انسانی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا کہ کسی شخص نے مناظرے کے نتیجے میں اپنے عقائد و نظریات تبدیل کیے ہوں۔

مناظر کا نقطہ نظر بالعموم اپنی ذات کو بلند و بالا کرنا، اپنے افکار کی مارکیٹنگ اور سیلف ایمپلائمنٹ ہوتی ہے۔ مناظر کی نیت خلقِ خدا کی ہدایت کی نہیں بلکہ اپنی بات کی "اُبچ" برقرار رکھنے سے آگے نہیں ہوتی۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہماری ختمِ نبوت کی کسی تحریک نے کوئی ایسا سائنسی سروے کروایا ہے جس سے ہمیں معلوم ہو کہ:

- لوگ کن وجوہ سے قادیانیت سے وابستہ ہوتے ہیں۔
- کن وجوہ کی بنا پر اس کے غلط ہونے کے علم کے باوجود اسے ترک نہیں کرتے۔
- کن اسباب سے لوگ قادیانیت سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کا مداوا کیا ہے؟

ہر چند کہ اس کا آغاز برطانوی سامراج نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے کیا لیکن آج تک اس کے تسلسل اور ارتقا کے اسباب کیا ہیں؟

مجھے اگرچہ اس موضوع پر کوئی تحقیقی علم حاصل نہیں ہے لیکن کچھ امور ایسے ہیں جو میں نے زندگی کے سفر میں دیکھے، محسوس کیے اور آج آپ سے شئیر کرنا چاہتا ہوں مثلاً:

"کسی بھی شعبے میں کوئی دیانت دار، خوش اخلاق، اپنے کام میں ماہر اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار کوئی فرد ملتا ہے تو یا وہ قادیانی ہو گا یا اس کے قادیانی ہونے کا شبہ ہو گا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمان ان صفات سے عاری ہیں اور وہ حُسن خلق سے لوگوں کے دلوں میں قادیانیت کی محبت کا بیج بو دیتے ہیں۔ قادیانیت مذہبی کے بجائے ایک سوشل نیٹ ورک زیادہ ہے۔ ہر شخص کا معاشی، سماجی خیال رکھنا لوگوں کو اس سے وابستہ رکھتا ہے۔"

دوسری طرف ردِ قادیانیت نے پڑھے لکھے لوگوں کو ایسے بے مصرف مسائل میں الجھا دیا ہے جن کی وجہ سے اصل مسئلہ نظر انداز ہو گیا مثلاً "حیات ونزول مسیح" اس پر مناظرے، تالیفات، مباحثے اور نہ معلوم کیا کیا ہے۔ گویا اگر عیسی علیہ السلام کی وفات یا عدم نزول ثابت ہو گیا تو مرزا صاحب نبوت کی مسند پر براجمان ہو جائیں گے حالانکہ میرے عقیدے کے مطابق ان دونوں باتوں میں سرے سے کوئی باہمی تعلق نہیں ہے۔

عیسی علیہ السلام زندہ ہوں یا نہیں، دوبارہ آئیں یا نہیں، مرزا صاحب نبی نہیں ہو سکتے۔ پھر ان مباحث سے خلق خدا کے ذہنوں کو الجھانے کا فائدہ؟

ظلی بروزی کی بحثوں کو تو خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے لیکن ان پر گفتگو کر کے لوگوں کے ذہن پراگندہ کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اگر مسلمان جہاں جہاں رہ رہے ہیں اپنے اپنے سماجی یونٹس بنا کر اپنے ممبرز کی اخلاقی تربیت، تعلیمی، معاشی اور سماجی ضروریات کی تکمیل کی طرف توجہ دیں تو جو لوگ ان وجوہ سے قادیانیت کی طرف مائل ہوتے ہیں ان کی تبدیلی رک سکتی ہے۔

اگر کسی سطح پر اکیڈمک گفتگو کی ضرورت ہو تو بس غلام جیلانی برق کی "حرفِ محرمانہ" اور علی میاں کی "ختم نبوت" ہی کفایت کرتی ہیں اور یہی دونوں کتابیں قادیانیوں نے بین کروائی تھیں ورنہ دوسری بھاری بھرکم علمی کتب نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

نیز اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جو لوگ غیر اعلانیہ قادیانی ہوتے ہیں اور اعلیٰ سیاسی، انتظامی، عدالتی اور عسکری عہدوں تک رسائی حاصل کر کے ملک کے آئین کو تبدیل کرنے یا قادیانیت کو پروموٹ کرنے کے اقدامات کرتے ہیں انہیں کیسے بے نقاب کیا جائے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسا طریقہ ہو جس کے ذریعے کسی بھی مخلص مسلمان پر غلط الزام لگانا ممکن نہ ہو۔

میری رائے یہ ہے کہ: "اس سارے مسئلہ کا سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کر کے اس کا کوئی مستقل حل تلاش کیا جائے۔ ہماری ذمہ داری لوگوں کو اسلام سے دور کرنا، متنفر کرنا یا فتوے لگا کر کاٹ پھینکنا نہیں ہے بلکہ کٹے ہوئے لوگوں کو واپس دامانِ محمد عربی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے وابستہ کرنا ہے۔

☆☆☆

بھلے نہ چھوڑیئے مگر چھیڑیئے بھی نا

یہ سب قرآن کے عالم ہیں سب نے اسکی تفہیم اور تفسیر لکھی ہے، غلام احمد پرویز نہ معجزے کو مانتے ہیں، نہ کسی مافوق الفطرت بات کو، حدیثوں پر تنقید اور شک کرتے ہیں، بلکہ منکر بھی نظر آتے ہیں۔

غامدی صاحب صرف ان حدیثوں پر غور کرنے کو تیار ہیں جو قرانی آیات کا کانٹکسٹ ظاہر کریں۔

ڈاکٹر اسرار کو اسلام کے سیاسی نظام میں جمہوریت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، انکا اسلامی حاکم مطلق العنان ہے۔

مودودی صاحب اسلام کو جمہوری طریقے سے نافذ العمل سمجھتے ہیں، بلکہ عین اسلام جانتے ہیں۔

مودودی فکر کے ایک عالم مولانا وحید الدین (انڈیا) جو اب مودودی صاحب کو چھوڑ چکے، سمجھتے ہیں کہ اسلام ہر مذہب کی طرح ایک روحانی اپیل رکھتا ہے، سیاست کو اسلام کا حصہ سمجھنا مودودی صاحب کی فہم کا قصور ہے۔۔۔ اور جن آیات کو مودودی صاحب اپنی اسلامی سیاسی سوچ کی بنیاد بتاتے ہیں، انکا قطعی وہ مطلب نہیں جو مودودی صاحب نے لے لیا۔۔۔

آپ بریلوی مسلک کے کسی عالم کی تفسیر پڑھیں، وہ متن میں تو نہیں لیکن تفسیر، تفہیم میں صوفیا کرام کے خیالات اور عمل کو بھی داخل کر دیتے ہیں۔

یہ صرف چند اپنے علاقے اور سُنّی مسلک کے علماء ہیں، شیعہ مسلک کے علماء کی اپنی الگ فقہ ہے، اصل وہ بھی قران سے ظاہر کرتے ہیں۔ گو تشریح اور تفسیر میں اہلِ بیت اور اماموں کی فکر عمل اور ہدایات کو سامنے رکھتے ہیں۔

آپ یہ دیکھیں کہ پوری دنیا میں مختلف علماء اپنی اپنی فکر کے مطابق قرآن کی تشریح پیش کررہے ہوں گے، اور سب کے الگ گروہ اور مسالک ہیں۔۔

ایسے میں اگر کوئی ان سب کی تفاسیر اور تفاہیم کو الگ رکھ کے خود اپنی سمجھ کے مطابق قرآن کی تفہم بیان کرے گا تو ایک نئ فکر اور گروہ کی تشکیل کرے گا۔

در ایں حالات آپ اسلام کی کوئی ایسی تشریح پیش نہیں کرسکتے جو تمام مسالک کو مکمل طور پر قابلِ قبول ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ کس عالم کی تشریح و تفہیم کے مطابق معاشرے یا ملک پر اسکا نفاذ کیا جائے؟

اس لیے مناسب راستہ تو یہی ہے کہ کسی کے مسلک اور عقیدہ کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں، سب اپنے حساب سے اپنے اسلام پر چلتے رہیں، اور کسی ایک مسلک یا فکر کا اسلام پورے معاشرے میں لاگو نہ کیا جائے، خاص طور پر ہمارے ملک میں جہاں ہر مسلک اور فکر کے لوگ اچھی تعداد میں موجود ہیں۔۔ کیوں کہ ایسی کسی بھی کوشش سے ملک میں انتشار پھیلے گا، فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھے گی، اور یوں بھی پچھلے ہزار سال سے کسی مذہبی ریاست کے قیام سے ملک کے رہنے والوں کے معاشی، سماجی اور روحانی حالات بہتر نہیں ہوے، تو ایسے کسی تجربہ کو دہرانے کا فائدہ۔۔۔؟

☆☆☆

ان کی درجن ۱۳ کی ہے

جس پہ تیرا کرم ہے وہی باکمال ہے
گر ہو نہ تیرا فیض تو جینا محال ہے

بانو آپا کے بابا صاحبا (اشفاق احمد) کہا کرتے تھے کہ "جس پر کرم ہو اس سے پنگا نہیں لینا چاہیے کہ وہ تو کرم پر چل رہا ہے۔ اور اگر کوئی چلتی مشین میں ہاتھ دے گا تو اُڑ جائے گا، تباہ ہو جائے گا"۔ ہمارے ارد گرد ایسے سینکڑوں کرم یافتہ لوگ نظر آتے ہیں جنہیں جب ہم اپنی ناقص عقلوں کے پیمانے پر پرکھتے ہیں تو ہمیں حیرانگی ہوتی ہے کہ یہ کرم یافتہ کیوں ہیں؟

نہ ہم سے سیانے ہیں، نہ ہم سے زیادہ خوبصورت ہیں؟ نہ ہم سے زیادہ عقل مند اور پڑھے لکھے ہیں تو ان کے پاس آسائشوں کے انبار کیوں ہیں۔ ان کے بچے خوبصورت، تابع فرماں اور کامیاب کیوں ہیں؟ ان کے بنگلے بڑے اور گاڑیاں لمبی کیوں ہیں؟ معاشرے میں انہیں عزت کی نگاہ سے کیوں دیکھا جاتا ہے؟ ان کا طوطی کیوں بولتا ہے؟ اصلاً تو یہ سوچ ہی بیمار، حسد اور بغض سے اٹی ہوئی ہے اور مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ کرم یافتہ ہونے کے لیے کوئی مخصوص میرٹ یا کوالیفیکیشن نہیں ہے۔ البتہ کرم یافتہ لوگوں میں کچھ عادات مشترک دیکھی گئیں ہیں۔ ربّ العزت اپنی ذات میں بہت حساس بھی ہے۔ وہ اپنی صفات میں کسی دوسرے کو کسی کم تر درجے میں بھی شریک نہیں کرتا اور نہ ہی کسی شریک کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ تکبر، غرور اور بے نیازی ایسی صفات صرف خدا کو ہی واجب ہیں۔

اور اس کھلے راز کو ان کرم یافتہ لوگوں نے پالیا ہوتا ہے۔ مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ ہر کرم یافتہ اور فیض یاب شخص عاجز ہو گا۔ عقل و علم کے باوجود سیدھا سادھا (Down to Earth)اور تیزی طراری سے کوسوں دور ہو گا۔

کرم کو اپنے زور بازو کا شاخسانہ نہیں ربّ العزت کی عطا سمجھے گا۔ غصہ بناوٹ، تکبر اور ہٹ دھرمی کے بجائے درگزر، معافی، انسان دوستی اور اخلاق اُس کا زادِ راہ ہوں گے۔ میں نے ہر صاحب کرم کو احسان کرتے دیکھا ہے، وہ حق سے زیادہ دیتا ہے، اُس کا درجن 13 کا ہوتا ہے، وہ Haves پر زندہ رہتا ہے نا کہ Not Have پر اور یاد رہے حساب پر چلیں گے تو حساب ہی چلے گا۔

دل کے کنجوس کے لیے کائنات بھی کنجوس ہے اور دل کے سخی کے لیے کائنات بھی "گنجینہ گوہر" ہے۔ جب کبھی زندگی رُک جائے، ناامیدی گھیرے ڈال رہی ہو، لوگوں سے گلے اور شکوے شروع ہو جائیں، خوشی ناپید ہو جائے، سوچیں بیمار ہو جائیں اور معاملات اَڑ جائیں۔ تو سمجھ جایئے کہ آپ خود بھی دوسروں کے معاملات میں "اڑچن" کا باعث ہیں۔ "زندگی دوسروں کے عیوب پر نہیں اپنے محاسن پر گزاریئے" جو چاہیے، پہلے وہ دیجیے۔ آسانیاں دو گے آسانیاں ملیں گی۔

گلاب پھر سے مہک اٹھیں گے یقیں رکھو
یقین رکھو جو ہوا وہ خدا کی جانب سے امتحان تھا

☆☆☆

ذہنی پولیو

جسمانی پولیو عذاب ہے لیکن اس سے بڑا عذاب ذہنی پولیو ہے۔ معاشرہ فکری اور نظری اعتبار سے اپاہج ہو جائے تو زندہ دکھائی دینے کے باوجود، زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ حریتِ فکر کی فکر کیجیے کہ ہمارے معاشرے کو اس سے محروم کیا جا رہا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ریاست ہی نہیں، سماج کو بھی نئی رفعتوں سے آشنا کیا۔ علامہ اقبال نے آزادی رائے کے باب میں انہیں امت کا امام کہا ہے (The first critical and independent mind in Islam)۔ سید نذیر نیازی نے علامہ کے انگریزی الفاظ کا ترجمہ کیا ہے:

"وہ اس امت کے اولیں دل و دماغ ہیں جو ہر معاملے میں آزادی رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے۔"

اقبال نے عہدِ رسالت کے جس واقعے کو بطور مثال پیش کیا ہے، اگر میں نقل کروں تو بہت سی جبینیں شکن آلود ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں کوڑا تو تھا، لیکن مجرموں کے لیے، آزادی رائے کو دبانے کے لیے نہیں۔ ایسا ہوتا تو سب سے پہلے اس خاتون کی پیٹھ پر برستا جس نے سرِ عام ان کے فیصلے کو چیلنج کیا جب انہوں نے حق مہر کی تحدید کرنا چاہی، یا پھر اُس پر جس نے ان کے کُرتے پر سوال اٹھایا تھا۔ برسبیلِ تذکرہ ان کے ہاتھ میں ہر وقت تازیانہ بھی بعد میں آنے والوں نے پکڑایا۔

میرا برسوں کا مشاہدہ یہ ہے کہ "اتحاد بین المسلمین" وہ نعرہ ہے جو ہر مسلک کا علم برادر بلند کرتا ہے لیکن اُس پر دل سے کوئی یقین نہیں رکھتا۔ میرا یہ خیال دن بدن پختہ سے

پختہ تر ہوتا جارہا ہے کہ جیسے جیسے کوئی ایک مسلک سے وابستگی میں بڑھتا چلا جاتا ہے، وہ اس نعرہ سے عملاً دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ سب مل کر ایک کو دائرہ اسلام سے خارج کریں۔ پھر اس کارِ خیر کو سرانجام دینے کے بعد اگلا شکار تلاش کریں۔

برسوں پہلے کی بات ہے، میں راولپنڈی کے ایک بڑے مدرسے ''تعلیم القرآن'' کے ایک جلسے میں شریک تھا جس کا عنوان ''ختمِ نبوت'' تھا اور اس میں سب مسالک کے لوگ شریک تھے۔ اس مدرسے کا تعلق دیوبندی مکتبِ فکر سے ہے۔ جلسے میں معروف شیعہ عالم ''ع غ کرّاروی'' بھی شریک تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا تو کہا:

''آج میں بھی چار یاری ہو گیا ہوں۔''

سامعین نے یہ سنا تو نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سامعین کی اکثریت ظاہر ہے کہ دیوبندی تھی۔ نعروں کا شور کم ہوا تو کرّاروی صاحب نے اپنے جملے کی شرح کی۔ یہ شرح کچھ یوں تھی کہ:

''آج ختمِ نبوت کے مسئلے پر دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ، سب ایک ہو گئے۔ اس لیے میں بھی ان چار یاروں میں شامل ہو گیا۔ وماعلینا الا البلاغ۔''

اس کے بعد سامعین پر جیسے اوس پڑ گئی۔ پھر میں نے اسی مدرسے میں ان چار یاروں میں سے ایک کے لیے ''کافر کافر'' کے نعرے سُنے۔

ہزروں صفحات لکھے اور چھپے ہوئے موجود ہیں کہ مذہبی معاملات میں ایک دوسرے سے اختلاف کے نتیجے میں لوگوں نے انتہاؤں کو چھوا ہے۔ صرف مولانا مودودی کے بارے میں دیوبندی اکابر کی تحریریں پڑھ لیں تو آپ کو اندازہو جائے۔ میرے علم میں نہیں کہ اتحاد بین المسلمین کے داعین میں سے کسی ایک نے اپنے اکابر کی آرا سے رجوع یا اعلان برأت کیا ہو۔

''اتحاد بین المسلمین'' کے نعرے سے نقاب الٹنے کے لیے اکثر ایک واقعہ کفایت کرتا ہے۔ لوگ دوسروں کے بارے میں اصل خیالات سامنے لے آتے ہیں۔ کبھی یہ کام شریعت بل نے کیا تھا اور کبھی ''عورت کی حکمرانی'' نے۔۔۔

مشرقِ وسطیٰ کی سیاست بھی اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالتی رہی ہے۔ یہ کارنامہ اس بار ''تحفظِ بنیادِ اسلام بل'' نے سرانجام دیا۔

ہمارے پاس اب دوراستے ہیں:

- ایک یہ کہ بین المسلمین اتحاد جیسے مصنوعی نعروں سے نکلیں اور حقیقت کے اعتراف کے ساتھ ایک لائحہ عمل بنائیں۔ اس کے لیے اتحاد بین المسلین کے بجائے مکالمہ بین المسلین ضروری ہے۔
- دوسرا یہ کہ مذہب کے معاملے میں ریاست کی مداخلت کو ان حدود میں مقید کر دیا جائے جو فطری ہیں اور دنیا بھر میں ریاستیں جن کالحاظ رکھتی ہیں۔

مسلمانوں میں اختلاف کیوں ہے؟ اس کا ایک سبب سیاسی ہے جو فرقہ واریت کی بنیاد بنا۔ ایک کسی متن کی تفہیم کا فطری اختلاف ہے جس نے مسلکی تقسیم کو جنم دیا۔ سیاسی اختلاف رکھنے والوں نے جب مذہبی جذبات کو استعمال کیا تو اپنے اختلاف کو مذہب کا لبادہ اوڑھادیا اور "دینی نصوص" کی ایسی تعبیر کی جو ان کے سیاسی موقف کی تائید کرے۔ یوں نتیجے کے طور پر مذہبی اختلاف اب "تاویل کا اختلاف" ہے۔ اسباب کے اختلاف کے ساتھ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِس وقت جو گروہ خود کو مسلمان کہتے ہیں، وہ سب ایک ہی ماخذ کی مختلف تعبیرات کو قبول کیے ہوئے ہیں۔

یہ کسی طور ممکن نہیں کہ سارے مسلمان کسی ایک تعبیر پر جمع ہو جائیں۔ اب عملی صورت یہ ہے کہ جو گروہ قرآن و سنت کو ماخذِ دین مانتا ہے، اس کے حقِ تعبیر کو قبول کیا جائے اور انہیں مسلمان سمجھا جائے۔ یعنی جو اللہ کے آخری رسول سیدنا محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو "مُنزَل من اللہ" کا واحد ماخذ مانتا ہے، لیکن آپ سے روایت کے کسی مختلف طریقے کو قبول کرتا ہے، اسے مسلمان سمجھتے ہوئے یہ حق دے دیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سب تعبیرات بیک وقت درست نہیں ہو سکیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تنوع کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس صورت میں سوال یہ نہیں کہ حق کیاہے اور باطل کیا؟ اصل سوال یہ ہے کہ اس اختلاف کے ساتھ رہنے کی کوئی تدبیر سوچی جائے۔ اس کے ساتھ سماج میں علمی سطح پر مکالمہ جاری رہے جس میں سب تعبیرات کے دلائل سامنے آجائیں۔ لوگوں کو یہ حق دیا جاے کہ وہ جس کو درست سمجھیں قبول کرلیں۔

اس باب میں ریاست کی مداخلت ایجابی نہیں؛ سلبی ہو۔ یعنی مثبت کے بجائے منفی ہو۔ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ کوئی مکالمے اور اختلاف کے مسلمہ آداب سے تجاوز نہ کرے اور اگر کوئی کرے تو اس کو سزا دی جائے۔ ریاست کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے کہ ''کسی کا عقیدہ کیا ہے اور کون اسلام کی کس تعبیر کو مانتا ہے؟'' ریاست کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ ''وہ کسی فرد یا گروہ کو اسلام کی کوئی خاص تعبیر اختیار کرنے کا پابند بنائے۔'' یہ مداخلت ''فی الدین'' ہے اور بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ہے۔

اس باب میں ریاست سے ''فاش غلطیاں'' سرزد ہیں۔ اب ان کے انڈے بچے نکل رہے ہیں۔ ہماری ریاست کو چاہیے تھا کہ وہ دنیا کے تجربات سے فائدہ اٹھاتی۔ دنیا میں ہر جگہ مذہبی تنوع پایا جاتا ہے لیکن جس ملک میں ریاست کی مداخلت جتنی کم ہے وہاں مذہبی اختلاف اتنا ہی کم ہے اور اس کے ساتھ مذہب بھی فروغ پا رہا ہے۔ جہاں ریاستی مداخلت زیادہ ہے وہ مذہب مسئلے کا حل نہیں، اس کا حصہ ہے۔

''تحفظِ بنیادِ اسلام بل'' نے اتحاد بین المسلمین کی حقیقت، مذہبی اختلاف کی نوعیت اور مذہب و ریاست کے تعلق جیسے مسائل کے باب میں ریاست اور علما کی کمزوری کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ اس نے ہمیں موقع دیا ہے کہ ان مسائل کے حل کی کوئی ایسی تدبیر تلاش کریں جو ایک طرف سماجی امن کو برقرار رکھے اور دوسری طرف ''علمی ارتقا'' اور ''فکری بالیدگی'' کو یقینی بنائے۔ ریاست، صاف دکھائی دیتا ہے کہ مذہبی اختلاف کو بنیاد بنا کر آزادی رائے کے دائرے کو محدود سے محدود تر کر دینا چاہتی ہے۔ یہ سماج کو ذہنی پولیو میں مبتلا کرنا ہے۔ کاش اس ملک کا دانش ور معاملے کی سنگینی کو جان سکتا!

☆☆☆

بچے اور ہم

کسی خاندان، ملک یا قوم کے مستقبل کی پیشین گوئی کے لیے بچوں اور نوجوان نسل کو دیکھ کر آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ اور ان بچوں کی تعلیم و تربیت میں معاشرے، خاندان اور ماحول کا اثر بھی ہوتا ہے لیکن بنیادی ذمہ داری سکول و کالج سے بھی زیادہ صرف "والدین" اور خصوصاً "ماں" کی ہے۔

سب سے پہلے تو والدین کو بچے کا "خدا" بننے سے اجتناب کرنا چاہیے اور اپنی ذاتی محرومیوں، الجھنوں، خانگی مسائل، مالیاتی و کاروباری اتار چڑھاؤ، اپنی ناآسودہ خواہشات اور اپنے بچپن کے نامساعد حالات کا بدلہ اپنے بچوں سے نہیں لینا چاہیے۔

جوں جوں وقت اور زمانہ بدل رہے ہیں، توں توں بچوں کی تربیت کے رنگ ڈھنگ نئے تقاضے کرنے لگے ہیں۔ اس وجہ سے بچے اور والدین دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کشمکش کا شکار ہیں۔

بچوں کی تربیت کے لیے پہلی درس گاہ ماں اور باپ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں کا ایک بات پہ متفق ہونا ضروری ہے اور بچوں کے سامنے اور سب کے سامنے انہیں بہترین والدین اور میاں بیوی کی صورت رہنا ہے۔ بچہ سب سے زیادہ دیکھ کر سیکھ رہا ہوتا ہے۔ لہذا پہلے تو والدین اور ساتھ رہنے والوں کو، جیسے مشترکہ خاندانی نظام ہے، اپنے ہر عمل کے ساتھ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بچہ یہی سب کچھ مستقبل میں کرے گا، جو دیکھ رہا ہے۔ خواہ آپ اس کو کتنا بھی کسی بات سے کیوں نہ روک لیں، جو اس نے دیکھا ہے، وہ کرنا "ناگزیر فطرت" ہے۔ یوں بھی بچے کو، جس بات سے مسلسل روکا جارہا ہوتا ہے، وہ اس کے لیے تجسس بن جاتی ہے اور وہ اپنے تجسس کی تسکین یا کھوج کے لیے اس عمل کو دہراتا ہے۔

بچوں کو خوف یا لالچ دے کر کام کرنے کی طرف آمادہ مت کریں ورنہ وہ ساری عمر خوف یا لالچ کے زیر اثر زندگی گزار دے گا، مزید دشواریوں کا شکار ہو جائے گا اور آپ کو بھی اس کا حصہ بنا لے گا۔ اس کو جو سیکھانا ہے، جو تربیت کرنی ہے، وہ یہ ہے کہ اسے جو کچھ کرنا ہے بحیثیت انسان کرنا ہی ہے اور انسان بھلائی کا کام کرتا ہے۔ اس پر اپنے کسی قسم کے نظریات مسلط مت کریں، اس کا زمانہ دوسرا ہے اور آپ کا دوسرا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"اپنے بچے کو وہ تعلیم نہ دو جو تم نے حاصل کی ہے بلکہ اسے اگلے زمانے کی تعلیم دو چونکہ کے وہ اگلے زمانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ اپنی تہذیب ساتھ لاتا ہے اور ہمیں اسی کے مطابق تعلیم بھی دینی ہے اور تربیت بھی۔ تعلیم نے تو وقت کے ساتھ ساتھ کسی حد تک اپنے معیارات بدل لیے ہیں مگر تربیت ابھی ماضی کی پرستش میں مشغول ہے۔

تعلیم اور تربیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بچے کو اسکول اور ٹیوشن بھیج کر ہم اس کے تربیتی تقاضے پورے نہیں کر رہے بلکہ علمی تقاضے پورے کر رہے ہیں۔

علمی تقاضوں کی پہلی سیڑھی والدین، خاندان، دوست احباب، بچوں کے دوست، ان کے خاندان کے رویے اور اعمال ہیں، جو بچہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل کود، ملنے ملانے اور کھانے پینے کے دوران سیکھ رہا ہوتا ہے۔

جب بچہ بڑا ہو رہا ہوتا ہے تو ہم اسے ڈراتے ہیں، سو جاؤ، بلی آجائے گی، جن آجائے گا یا اس کو کسی چیز کا لالچ دیتے ہیں اور یوں اس کے ذہن میں کچھ کرنے کے لیے ڈرنا یا لالچ جگہ بنا لیتے ہیں۔ اس طرح بچے نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اس کا اعتماد اس کی اپنی ذات پہ بحال کرنا تربیت کا سب سے اہم نکتہ ہے۔ ذات پہ اعتبار تب آتا ہے، جب وہ اپنے کام آپ کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ جوں جوں وہ بڑا ہونے لگے تو اس سے وہ کام، جو وہ کر سکتا ہے کروائیں تاکہ وہ خود مختار ہونا سیکھے اور یوں اس کا اپنی صلاحیتوں پہ اعتماد بڑھنے لگتا ہے۔ وہ جتنا جلد خود مختار اور پر اعتماد ہو گا، اتنا ہی جلد اور بہتر عملی زندگی میں شامل ہونے کے قابل ہو جائے گا۔

لیکن ہم اپنے بچوں سے ان کا اپنا کام کروانا بھی شاید "چائلڈ لیبر" سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ خود اس کے سب کام کر کے دیں۔ اس طرح وہ عمر بھر یہی توقع کرتا رہتا ہے کہ

اس کے کام دوسرے کریں۔ کچھ والدین تو انہیں اپنی ذات کے گرد اتنا محو کر لیتے ہیں کہ اس کا اعتماد عمر بھر انسانوں سے اٹھ جاتا ہے۔

بچہ جب بڑا ہو رہا ہوتا ہے تو گھر میں چیزوں کو بکھیرنا اور غلطیاں کرنا ایک عام سی بات ہے مگر ہم اسے مار کر یا ڈانٹ کر منع کر دیتے ہیں۔ خوف سے وہ سہم تو جاتا ہے مگر غلطی کرنا اس کی جبلت ہے، موقع ملتے ہی وہ غلطیاں کرنے لگتا ہے۔ کسی کے گھر جا کر یا اسکول جا کر، تب ہمیں ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور نتیجتاً ہم اس پہ مزید سختی کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ وہ گھر میں غلطیاں نہیں کرے گا تو باہر کرے گا۔ کیونکہ اس نے عملی زندگی کو غلطیوں سے ہی سیکھنا ہے۔ اس کو گھر میں غلطی کرنے دیں اور اس کا نتیجہ جب سامنے آتا ہے، اوّل تو وہ اسی سے سیکھ جاتا ہے کہ اب اسے یہ کام نہیں کرنا۔ تب اگر آپ اس کو سمجھا دیں کہ دیکھا ایسا کرنے سے یہ ہو گیا تو وہ خود محتاط ہو جائے گا۔

بچے کو اجنبی جگہوں پہ لے کر جائیں، اجنبی لوگوں سے ملاقات کروائیں تاکہ اسے جگہ کے بدلنے اور نئے لوگوں سے مانوس ہونا اور انہیں قبول کرنا آئے۔ لوگوں اور خصوصاً اجنبی اور نئے افراد کے سامنے اس کی رہنمائی کم سے کم کریں۔ ہم یہی سب سے زیادہ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو بتا سکیں کہ ہمارے بچے ہمارے کتنے کنٹرول میں ہیں۔ مگر مستقبل قریب اس کا پردہ فاش کر دیتا ہے۔ جونہی بچہ ذرا طاقت ور ہوتا ہے تو وہ کسی بھی صورت اس کنٹرول سے بغاوت کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی عزتِ نفس مجروح ہو رہی ہوتی ہے جب کہ ہم سمجھتے ہیں کہ بچے کی عزتِ نفس ہوتی ہی نہیں ہے۔ بچے کو ممکن اور ضروری حد تک آزادی دیں کیونکہ سیکھنے کا عمل آزادی کا تقاضا کرتا ہے۔

بچے کا جسم کھیل کود یا اچھلنے کودنے کا تقاضا کرتا ہے، جو اس کی ذہنی و جسمانی نشو و نما کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ کھیلوں میں شمولیت کریں۔ اس کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ والدین اس کے کھیل کود کا حصہ بنیں۔

آج کے دور کی بات کی جائے تو اب "کارٹون برائے کارٹون" کا دور ختم ہو چکا ہے۔ کارٹون کہانیوں میں سب رشتے ہوتے ہیں، جو بہت آئیڈیل صورت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے والدین اور دوسرے رشتوں کو بھی اس آئیڈیل صورت میں دیکھنا

چاہتا ہے، جب نہیں دیکھتا تو اس آئیڈیل کے قریب، جو بھی شخصیت لگتی ہے، اس کا جھکاؤ اس کی طرف ہو جاتا ہے۔

اس لیے اپنے بچے کے آئیڈیل کو کم از کم سمجھنے کی کوشش ضرور کریں۔ جب آپ بچے سے بات کریں گے، ڈائیلاگ کریں گے، اسے وقت دیں گے تو وہ اپنے تصور کی تصویر آپ کے سامنے خود بنا دے گا۔ لیکن اس سب کے لئے آپ کو وقتی طور پہ اس کے ذہنی معیار تک آنا ہو گا یعنی وقتی طور پہ بچہ بننا ہو گا۔

بچے میں قوتِ برداشت پیدا کریں۔ جب ہم بات کر رہے ہوتے ہیں اور اچانک بچہ آ جائے تو ہم اپنی بات چھوڑ کر اس کی سننے لگتے ہیں۔ ہمیں چاہیے ہم اسے کہیں کہ پہلے ہم بات مکمل کر لیں تو آپ کیجیے گا۔ یوں اس میں "تہذیبِ گفتگو" پروان چڑھتی ہے اور قوتِ برداشت بھی پیدا ہوتی ہے۔

لڑکے اتنی سست روی سے بڑے ہوتے ہیں کہ بچپن کا عرصہ لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ لاڈ پیار حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو سماجی ہے لیکن طبعی لحاظ سے بھی یہ بات اہم ہے کہ لڑکیاں جلد بڑی لگنے کی وجہ سے اچانک کم توجہی کا شکار ہو کر چڑچڑی ہونے لگتی ہیں۔ ان کے بچپن کا چڑچڑا پن توجہ کا طلب گار ہے۔ جب بچے ذرا چلنے اور بولنے کے قابل ہوتے ہیں تو چڑچڑے ہو کر ہاتھ اٹھانا ایک عام رویہ ہے، جس کو ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ مارتا/مارتی ہے۔

اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ وہ مار رہے ہیں۔ وہ چونکہ ابھی روانی سے بول نہیں سکتے، تیزی سے بھاگ نہیں سکتے، گویا اپنی لسانی و جسمانی حفاظت اور دفاع نہیں کر پا رہے ہوتے تو جب وہ کسی بات سے زِچ ہوتے ہیں تو یہ دفاعی ردِ عمل اختیار کرتے ہیں، تب ان کو توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس موقع پہ آپ بھی اسے فوری تھپڑ مار دیں گے تو ممکن ہے آپ کے اس عمل سے وہ تشدد سیکھ لے کہ جب اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو وہ بھی مارنا شروع کر دے۔ کیونکہ آپ نے اپنی مرضی کے خلاف کا ردِ عمل تشدد دکھایا ہے۔ اس لیے ان نازک مراحل سے بہت نزاکت سے گزرنا پڑتا ہے۔

سب بچے ایک جیسی توجہ کے طالب و مستحق ہوتے ہیں۔ بڑے بچے کو مسلسل بڑا اور چھوٹے کو مسلسل چھوٹا کہہ کر ان کی ذات کی نفی مت کیجیے، دونوں کو جینے کا برابر کا حق ہے، ان سے چند سال بڑا ہونے کی وجہ سے ان کا بچپن مت چھینیں۔

ماں کی گود کو تربیت کی پہلی درس گاہ کہا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ ہمارے مشرقی معاشروں میں بیٹی کی تربیت کرتے وقت ہم سسرال کا نقشہ خود ہی اس کے ذہن میں بنا دیتے ہیں اور اس تربیت گاہ سے میکے و سسرال سب کو شکایات ہوتی ہیں۔ ''سسرال جاؤ گی تو پتا لگے گا، تمھیں کیا پتا سسرال میں کیسے کیسے مصائب سہنا پڑتے ہیں، میں نے کیسے گزارا کیا ہے یہاں؟'' یہ وہ روایتی جملے ہیں، جن کو سسرال اور شادی کی تربیت کے لیے ہر لڑکی کو تو اپنی اوائل عمری سے ہی سننے پڑتے ہیں۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ خوف کے سائے تلے ایک مجبور اور نفسیاتی بیمار زندگی گزارنے کی تیاری کا عمل ہے۔ لہذا یہاں سے ایک ''نفسیاتی بیمار سماج'' کا آغاز ہوتا ہے اور پھر یہ لڑکی ایک ڈری سہمی نسل کی سربراہ بن جاتی ہے۔ گویا شادی سے پہلے ہی بلکہ اس کی بلوغت سے پہلے ہی اس کو سسرال اور دوزخ کا منظر نامہ ایک جیسا بتایا جاتا ہے۔ لہذا شادی کے فوری بعد وہ بنا سوچے سمجھے دوزخ کی آگ سے بچاؤ کے اقدامات کرنے لگتی ہے۔ اتنے میں وہ بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ اب اس کے ڈر خوف والی نفسیات کا ایک چھپا ہوا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بھی اس آگ سے بچانے کی کوششوں میں اپنا حال خراب کر لیتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ بچوں کا ناتا ننیھال سے قریب ہو۔ یوں چاند ماموں بن جاتا ہے اور شاید چاندنی خالہ۔ ایسا مت کریں بلکہ بچے کو سسرال اور شوہر کا اچھا نقشہ دیں، خواب بھی مت دیں لیکن دوزخ بھی نہیں۔

آپ نے اگر بچی کی تربیت اچھی کی ہے تو اسے اپنے گھر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے دیں۔ نئی جگہ، نیا ماحول، نئے لوگوں سے مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا ہے۔ اگر یہ تربیت کا حصہ رہا ہو تو وہ جلد گھل مل کر اس ماحول کو قبول کرنے لگتی ہے۔ اس طرح ایک مطمئن لڑکی ایک تربیت یافتہ نسل پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عفت شہاب

مفتی تم کُریدتے بہت ہو اور میں نے کُریدے بغیر مان لیا اور "کھٹ" لیا (ڈاکٹر عفت شہاب)

کتاب بینی کی لت تو اوائل عمری ہی سے لگ گئی تھی اور اِسے "روگ" میں ممتاز مفتی نے تبدیل کر دیا۔ ممتاز مفتی انسانی عادات و خصائل پر اس قدر جزئیات اور باریک بینی سے لکھتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور اپنے گندے "پوتڑے" تو وہ بیچ چوراہے میں دھونے سے گریز نہیں کرتا۔

ممتاز مفتی نے ہی مجھے علم و حکمت کی "سان" پر ذات کے نوکیلے کونے ہموار کرنے والے استادَ محترم پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب سے متعارف کروایا اور قدرت اللہ شہاب سے بھی ابتدائی شناسائی مفتی صاحب کے ذریعے ہی ہوئی۔ جب شہاب نامہ پڑھا (اس پر ہونے والی تنقید بھی پڑھی ذاتی طور پر اس میں کوئی وزن محسوس نہیں کرتا) تو بہت سے جاندار کرداروں میں ڈاکٹر عفت مرحومہ کا کردار جاندار ترین نظر آتا ہے۔

انسان کا منتہاء اسکی بقاء کی کامیاب تلاش میں ہے۔

عورت کی بقاء اولاد سے جڑی ہے۔ اس سے بڑی قربانی کیا ہو گی کہ عورت اپنی بقاء کا سودا اپنی زندگی سے کرے۔ حادثاتی سودے تو اموات کی صورت میں ہو جاتے ہیں، کمال تو یہ ہے کہ انسان خود اپنی مرضی سے یہ سودا کرے۔

آج کا دن میرے لیے شاید اتنا اہم نہ ہوتا اگر مجھ پہ یہ بقاء کا راز ایک دم آشکار نا ہوتا۔

ممتاز مفتی صاحب کو شاید میں کبھی معاف نہیں کر سکوں۔ انہوں نے انسان کی کافی ساری انتہاؤں کو اس حد تک بیان کر دیا ہے جس حد کی نارمل حالات میں اجازت نہیں ہوتی۔ یہ بھی مفتی صاحب کا کارنامہ ہی سمجھیں کہ انہوں نے ڈاکٹر عفت شہاب کا یہ راز فاش کیا کہ وہ خود دربارِ

رسالت میں عرض کرتی ہیں کہ: "اے اللہؐ! میری عمر بھی قدرت اللہ شہاب کو دے دیں کیونکہ وہ ثاقب کی تربیت مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں۔"

سترہ جون ڈاکٹر عفت شہاب کی برسی ہے۔ میں ان کو ذاتی طور پہ چند واقعات کے علاوہ نہیں جانتا۔ واقعات بھی ایسے جو کہ ممتاز مفتی اور چند اور دوستوں سے سننے یا پڑھنے کو ملے۔ لیکن عورت ہونے کے علاوہ بھی ان کیلئے عزت کے بہت پہلو ہیں۔

میرے ساتھ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ لفظ بیان سے قاصر ہوں۔ اور یہ موقع بھی ایسا ہی ہے۔

اپنی بقاء کی قربانی شاید ان کو اس قدر دوام عطا کر گئی کہ "کینٹربری" کے قبرستان میں ڈاکٹر عفت شہاب کی قبر کو یہ اعزاز ضرور حاصل ہے کہ وہاں سب سے زیادہ لوگ آتے ہیں۔ اب ہر بندہ فاتحہ خوانی اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے مذہب کے مطابق کرتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے انگلینڈ میں مقیم ایک دوست نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ وہ ڈاکٹر عفت شہاب کی قبر کا پتا کرنے کیلئے وہاں کی ہیلپ لائن سے رابطہ کیا۔ تو ہیلپ لائن پہ موجود عورت نے قبر کا پتا بتانے کے بعد کہا کہ "یہ یقیناً کوئی نیک عورت ہے کیونکہ ان کی قبر کا پتا پوچھنے والوں اور ان کیلئے دعا کرنے والوں کی تعداد ان گنت ہے۔"

آج ایک اور دوست نے ایک واقعہ شئیر کیا کہ وہ اور ان کی بیوی ڈاکٹر عفت شہاب کی قبر پہ گئے۔ قبر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی مرمت کروائیں گے۔ لیکن کچھ دن بعد جب دوبارہ وہاں گئے تو دیکھا کہ کوئی انجان قبر کی مرمت کروا گیا تھا۔ انہوں نے حیرانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مرمت کا میٹیریل واپس کر دیا۔

نہ جانے کیوں اس موقع پہ مجھے میاں محمد بخش (کھڑی شریف) کا ایک مصرعہ یاد آ رہا ہے کہ:

اپنی ہر اک چیز محمد رکھدا نِت سنبھالی

وہ سب کچھ جو میں کہنا چاہ رہا تھا اور اپنی کم علمی سے کہہ نہیں پایا یہ مصرع مجھ سے زیادہ بہتر بیان کر رہا ہے۔

☆☆☆

روحانی تکیہ

گناہ کے امکانات سے بچنے کے لیے دعوت اسلامی کے امیر جناب الیاس عطار قادری رضوی دام اقبالہم نے جو ایجادات فرمائی ہیں ان میں ایک "مدنی تکیہ" بھی ہے۔ "قفلِ مدینہ" نام کی عینک کا بھی شاید ہی آپ نے سنا ہو جو بد نظری سے بچانے کیلیے تخلیق کی گئی ہے۔

"مرکز فیضانِ مدینہ" پر تکیے بکتے ہوئے دیکھے تو پوچھے بنا رہ نہ پایا کہ اس تکیے میں کیا خاص بات ہے جو بند گان توحید اس پہ ٹوٹے جا رہے ہیں؟ بتانے والے نے بتایا کہ موٹر سائیکل سواروں کو گناہ سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ تکیہ تخلیق پایا ہے۔

مگر کیسے؟

بتایا گیا کہ ڈبل سواری کے دوران اس تکیے کو بیچ میں رکھنے کا حکم ہے تا کہ شیطان کی جگہ نہ بن سکے۔ آپ یقین جانیے اوّل تو جھٹکا لگا کہ موٹر سائیکل پہ دو سواروں کے بیچ شیطان کا کیا کام، پھر جونہی سمجھ آیا تو حضرت قادری صاحب کی اس حُسنِ نیت پہ بھی میرے پاس لاحول پڑھنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

پندرہ برس تک موٹر سائیکل کی ہمہ جہت عیاشیوں کا لطف لینے والا مجھ ایسا سیاہ کار کھڑا یہی سوچتا رہا کہ شیطان کی جس واردات کی طرف میرا گمان کبھی پل بھر کو نہیں گیا حضرت قادری صاحب کا کیسے چلا گیا؟ نصابی علم کے مطابق قادری صاحب کی بات درست ہی ہو گی، مگر غیر نصابی طور پہ کیا آپ بھی اس کی تائید کرنے کی ہمت کر پائیں گے؟ یہ تکیہ جس نے ثریا سے بھی بلند کسی تصور سے جنم لیا ہے، یہ گناہ سے روک رہا ہے یا پھر کسی گناہ کے امکان کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔ میرا گمان تو اس امکان کی طرف پہلی مرتبہ اسی تکیے سے گیا۔

☆☆☆

سورۃ الرحمٰن کا اعجاز اور پیر صفدر شاہ بخاریؒ

قرآن کا بنیادی موضوع انسان ہے اور مقصد انسان کی روحانی تطہیر ہے، خدا سے جوڑنا ہے۔ مقام رسالت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ سے شناسائی ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ کی الحمد سے سورۃ الناس تک ہدایت ہی ہدایت اور شفاہی شفا ہے۔ قرآن روحانی وجسمانی عوارض کے لیے کافی وشافی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الرحمٰن کو خصوصی مقام واہمیت حاصل ہے۔

سورۃ الرحمٰن: ربّ کی رحمتوں کا زمزمہ، روحانی شفا اور فکری بصیرت کی روشن کرنیں

قرآن حکیم کا قلب، سورۃ الرحمٰن، اپنی لازوال فصاحت وبلاغت اور سرمدی تکرار ''فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ'' (پس تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟) کے ساتھ، کائنات کے ذرے ذرے میں بکھری اللہ ربّ العزت کی لاانتہا نعمتوں، اس کے عدلِ کامل اور تخلیق کے بے عیب توازن کا ایک مقناطیسی مرقع پیش کرتی ہے۔

یہ صرف ایک سوال نہیں بلکہ انسان اور جنات کی روحوں پر دستک دینے والی ایک ابدی حقیقت ہے جو انہیں خالق کی قدرتِ کاملہ، آفاق میں پھیلی نشانیوں اور یومِ جزا کی ناقابلِ تردید سچائی پر غوروخوض کی دعوت دیتی ہے۔ یہ محض شکر گزاری کا تقاضا نہیں بلکہ روحانی وجسمانی شفا، وجودی گہرائی، روحانی بالیدگی اور اخلاقی اعتدال کا پرچم بلند کرتی ہے۔ اسی الٰہی پیغام کی پرتو ہمیں چند ایسی عبقری ہستیوں کی زندگیوں اور فکری جدوجہد میں بھی نظر آتی ہے جنھوں نے اپنے اپنے اسلوب سے اس آفتابِ معرفت کو تابندہ رکھا۔

گزشتہ تین دہائیوں سے مشاہدے میں آیا ہے کہ بڑے شہروں کے بعض ہسپتالوں کے آئی سی یوز میں، کالجوں یونیورسٹیوں میں ، انفرادی و اجتماعی طور پر سورۃ الرحمٰن کو

مخصوص انداز میں ”قاری عبد الباسط مصری“ کی آواز میں سننے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، اور ہزاروں لوگوں سے اس کے مثبت اثرات کے حیران کن واقعات سننے کو ملے ہیں۔

اس آہنگ میں سننے کی تعلیم ”پیر سید صفدر علی شاہ بخاریؒ“ کا اعجاز ہے۔

پیر سید صفدر علی شاہ بخاری المعروف ”کاکیاں والی سرکارؒ“ (1920-2005ء، وصال: 8 فروری 2005)، ضلع جہلم کے مردم خیز علاقے للہ کے قریب ایک گاوں سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے عظیم صوفی بزرگ، عارف باللہ اور سلسلہ نقشبندیہ کے جلیل القدر شیخ تھے۔ روزنامہ خبریں میں بہت دیر کالم بھی لکھتے رہے۔ جن کی زندگی زہد و تقویٰ، مخلوقِ خدا سے بے لوث محبت اور دینِ حق کی بے مثال خدمت کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔ آپ کی خانقاہ علمی وروحانی تشنگان کے لیے ایک جامعہ کی حیثیت رکھتی تھی جہاں ہزاروں دلوں کو معرفتِ الٰہی سے سیراب کیا گیا۔

کاکیاں والی سرکارؒ کی تعلیمات کا ایک نمایاں پہلو سورہ رحمٰن کو قاری عبد الباسط مصری کی پر تاثیر آواز میں سننے کی تلقین تھا۔ آپ کی گہری بصیرت نے یہ ادراک کر لیا تھا کہ اس سورۃ کی آیات میں موجود صوتی حسن اور معنیاتی گہرائی، سماعت کو سرمدی سکون اور روح کو روحانی ارتقاء بخشتی ہے۔ آپ کے نزدیک یہ تلاوت فقط ایک سماعت نہیں بلکہ ربّ کی نعمتوں پر غور و فکر، اس کے حضور مکمل سپردگی اور روحانی و جسمانی امراض کے لیے شفا کا ذریعہ تھی۔ آپ کے مریدین اور عقیدت مند آج بھی آپ کی عطا کردہ اس خاص نصیحت کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں، اور یوٹیوب و دیگر پلیٹ فارمز پر آپ سے منسوب ویڈیوز میں یہ فیض عام ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

کئی لوگ یہ تجربہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کی ترغیب پر سورہ رحمٰن کی تلاوت سننے سے انہیں قلبی سکون کے ساتھ ساتھ مختلف جسمانی عوارض میں بھی افاقہ محسوس ہوا۔ آپ کا وصال جسمانی تھا، مگر آپ کی تعلیمات اور شفا بخشی کا روحانی فیض آج بھی لاکھوں قلوب کو منور کر رہا ہے۔ ان کی تعلیمات کا بنیادی ماخذ محبت خدا، ادراک مقام رسالت مآب صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ تھا۔ ان ہی کے بیٹے ”پیر منشا بخاری“ کا ایک ویڈیو کلپ بہت وائرل ہے کہ تمام تر صفات کا مالک صرف اللہ ہے۔ مزارات یا پیر کچھ دیتے نہیں صرف اللہ کی طرف مائل ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ میری ان سے ملاقات ہے۔ محبت اور دعاوں سے نوازتے ہیں۔

پیر سید صفدر علی شاہ بخاریؒ کے قابلِ فخر صاحبزادے اور ان کے علمی و روحانی ورثے کے مستحکم امین ہیں۔ میری ان سے ذاتی ملاقات نے ان کی شخصیت کی سادگی، بردباری اور روحانی کشش کا گہرا تاثر دیا۔ وہ اپنے والد اور مرشد کے مشن کو انتہائی خلوص اور مؤثر انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ پیر منشا بخاری کی گفتگو میں وہی روحانی حکمت اور قرآنی بصیرت نمایاں ہے جو ان کے والد کا خاصہ تھی۔ وہ روحانیت کو روزمرہ کی زندگی کے ساتھ مربوط کرنے پر زور دیتے ہیں اور خاص طور پر نوجوان نسل کو دین سے قریب لانے کے لیے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، جن میں ٹک ٹاک اور یوٹیوب سرفہرست ہیں، کا مؤثر استعمال کر رہے ہیں۔

لیکن پیر سید صفدر شاہ بخاریؒ کے روحانی فیض کے امین پی ٹی وی کے سابق پروڈیوسر سید شاکر عزیز ہیں۔ ڈاکٹر جاوید احمد صاحب اور سید حیدر جعفری صاحب بھی ان کی فکر کے پاسبان ہیں۔

☆☆☆

تاریخی ریکارڈ تو درست رکھیں!!!

29فروری کو پیدا ہونے والے بچوں کی سالگرہ عام طور پر 28فروری کو منائی جاتی ہے، لیکن دستاویزات میں ان کی تاریخ پیدائش 29 فروری ہی لکھواتے ہیں ، تبدیل نہیں کرتے۔

اگر ہمارے بزرگوں نے جمعہ 15 اگست کو وجود میں آنے والے پاکستان کی سالگرہ، کسی بھی مصلحت کے تحت 14اگست کو منانے کا فیصلہ کر لیا تو ٹھیک ہے۔۔۔!لیکن بچوں کو یہ تو بتایا جائے کہ پاکستان قائم 15اگست 1947 کو ہوا تھا۔

اب ہم جب بچوں کو بتاتے ہیں کہ پاکستان 14اگست 1947 کو جمعۃ الوداع کے دن بنا تھا تو وہ عادتاً اپنے فون یا لیپ ٹاپ پر چند clicks کر کے اگست 1947 کا کیلنڈر نکال کر ہمیں لاجواب کر دیتے ہیں کہ 14 اگست کو تو جمعرات تھی!یوم آزادی ستائیسویں روزے کے دن ہونا بھی بتایا جاتا ہے. 27رمضان بھی 15اگست کو تھی۔

قائدِاعظم نے 15اگست 1947 کو ریڈیو سے قوم کے نام پیغام میں کہا تھا:

August 15 is the birthday of the independent and sovereign state of Pakistan. Today is Jummat-ul-Wida, last Friday of holy month of Ramazan,a day of rejoicing for all of us

قائدِاعظم نے فروری 1948 میں امریکی عوام سے ریڈیو خطاب میں کہا:

This Dominion which represente the fulfilment, in a certain measure, of the cherished goal of 100 million Muslims of this sub-continent came into existence on August 15, 1947.

یہ اقتباسات بطور گورنر جنزل قائداعظم کی تقریروں اور بیانات کی سرکاری طور پر شائع کی گئی کتاب میں سے ہیں. انہوں نے اس تاریخ کا چند اور جگہ بھی ذکر کیا ہے۔

پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست سے 14 اگست کرنے کا فیصلہ کب اور کیسے ہوا، یہ ہمارے محقق دوست عقیل عباس جعفری بتاتے ہیں۔۔۔

"یہ معمہ نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، کیبنٹ ڈویژن، اسلام آباد میں محفوظ ان فائلوں سے حل ہوا جو ایک طویل عرصے تک خفیہ رہنے کے بعد اب عوام لیے کھول دی گئی ہیں۔ ان فائلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ منگل 29 جون 1948ء کو کراچی میں وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی زیر صدارت منعقد ہونے والے کابینہ کے ایک اجلاس میں، جس میں وزیر خارجہ، وزیر مواصلات، قانون و محنت، وزیر مہاجرین و آباد کاری، وزیر خوراک ،زراعت و صحت اور وزیر داخلہ ، اطلاعات و نشریات موجود تھے، فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 15 اگست 1948ء کی بجائے 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں۔ وزیراعظم لیاقت علی نے کابینہ کو بتایا کہ یہ فیصلہ حتمی نہیں ہے، وہ یہ معاملہ قائداعظم محمد علی جناح کے علم میں لائیں گے اور جو بھی حتمی فیصلہ ہو گا قائداعظم کی منظوری کے بعد ہو گا۔"

اس فائل میں یہ تحریر نہیں کہ اس تجویز کا محرک کون تھا اور یوم آزادی کی تقریبات 15 کی بجائے 14 اگست کو منائے جانے کے حق میں کیا دلائل پیش کیے گئے تھے۔ کارروائی کے آخر میں بریکٹ میں تحریر ہے:

Quaid-i-Azam has approved the suggestion.

قائداعظم نے تجویز کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد پاکستان کا یوم آزادی ہر سال 14 اگست ہی کو منایا جاتا رہا۔

بزرگوں کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں. لیکن بچوں کو کتابوں میں یہ حقیقت تو بتائی جائے کہ برتھ تو 15 اگست کو ہوئی، لیکن برتھ ڈے بھارت سے الگ 14 اگست کو منانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک جھوٹ کی وجہ سے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، مثلاً 13 اور 14 اگست کی درمیانی رات بارہ بجے ریڈیو سے اعلان ہوا. حالانکہ 14 اگست کو سارا دن بلکہ آدھی رات تک ریڈیو، "آل انڈیا ریڈیو" ہی رہا۔ 15 اگست شروع ہونے پر پاکستان براڈکاسٹنگ سروس بنا۔

☆☆☆

مگر ہم نہیں سیکھتے

فرقہ واریت، عدم برداشت، فتویٰ سازی اور شدت پسندی کی صنعت ہم نے جنرل ضیا الحق کے (جنرل صاحب سے قبل فرقہ واریت میں شدت نہیں تھی) زمانے سے لگانی شروع کی اب پھل پھول گئی ہے اور آئے روز خطرناک اور الارمنگ نتائج سامنے آرہے ہیں۔

مذہبی عدم برداشت اور جہالت پر سینکڑوں صفحات لکھے جاسکتے ہیں لیکن دانستہ مذکورہ بالا سطور کے بعد سیاسی عدم برداشت پر عرض کر لیتے ہیں کیونکہ مذہبی اس سے زیادہ برداشت نہیں کرپائیں گے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

تاریخ خود کو بلاوجہ نہیں دہراتی اور تجربہ (کسی دوسرے کا) بھی "خاصے" کی چیز ہے لیکن کم از کم ہمارے لیے بے سُود کہ ہم نے نہ کبھی تاریخ سے سیکھا اور کبھی کسی دوسرے کے تجربے سے فیض اٹھایا۔ اس لیے ہم گزشتہ 75 برسوں سے "ترقی معکوس" کے ایسے سفر پر گامزن ہیں جس کے نتائج غربت، انارکی، عدم برداشت، آمریتوں اور جمہوریت نما آمریتوں کی صورت میں سامنے ہیں۔

اور "ٹنل" کی دوسری طرف کہیں روشنی کی کرن نہیں۔۔۔

یہ ابھی کل کی بات ہے کہ افراد کی صورت میں بھی فاطمہ جناح سے لے کر اکبر بگٹی تک کو غدار کہہ کر دیکھ لیا۔ اور نیپ سے لے کر پیپلز پارٹی (پھر پی پی نے ایک 'پی' کا اضافہ کر لیا) تک کو بین کر کے دیکھ لیا۔

1977 سے 1983 تک سخت قسم کی سنسر شپ لگا کر دیکھ لی کہ پیپلز پارٹی اور محترمہ بے نظیر بھٹو کا نام اخبار میں شائع اور پی ٹی وی پر نشر نہیں ہو سکتا تھا۔

شاہی قلعے میں پیپلز پارٹی کے جیالوں کو کوڑے مار مار کر چمڑیاں اُدھڑی جارہی تھیں۔

پیپلز پارٹی کو سیکورٹی رسک کہا جارہا تھا۔ (جو کہہ رہے تھے ان کا نام رہنے دیں) لیکن بالا آخر وہ پارٹی 1983 کے بعد تین بار اقتدار میں آئی اور آج بھی سندھ میں اقتدار میں ہے، اور وہاں اسے کوئی بڑا چیلنج درپیش نہیں ہے۔ لیکن آج جب پاکستان کی عوام، تھینک ٹینکس، سول سوسائٹی، سپریم کورٹ بار، غیر جانبدار سروے اور عالمی ادارے بھی اس گھمبیر صورتِ حال کا علاج صرف نئے اور منصفانہ انتخابات کو قرار دے رہیں ہیں۔

ہم ایک بار پھر تاریک ماضی کو دہرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کل پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں آگ اگلی جائے گی۔ لیکن اگر ماضی کو دہرایا جائے گا تو نتائج بھی ماضی جیسے ہی برآمد ہوں گے۔

بے نظیر کو واپس لانا پڑتا ہے۔۔۔نواز شریف کو اقتدار دینا پڑتا ہے۔۔۔ اور آج کا نوشتہ دیوار عمران خان ہے. عمران خان کو سیاسی عمل کے بغیر "مائنس" کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو گی یا انار کی لائے گی۔

لیکن خرابی بیسار کے بعد کی گئی صورت گری ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکی ہوتی ہے۔

لیکن "انہیں" کیا لگے ان کا ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان میں کیا ہے؟

لیکن یاد رہے دیوانے بھی آتے رہیں گے جب تک "ٹنل" کے دوسری طرف روشنی ظہور پذیر نہیں ہوتی۔

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ

☆☆☆

زیادہ اولاد پیدا کرنے والی!

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ نے مسلمانوں کو تبلیغ کے ذریعے امت زیادہ کرنے کا حکم دیا تھا، اولاد زیادہ پیدا کر کے امت زیادہ کرنے کا نہیں فرمایا تھا۔ اولاد تو خود رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کی بھی زیادہ نہیں تھی۔۔ گیارہ بیویوں میں سے چار بچیاں۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کے حکم کو راوی نے اپنی تفہیم کے مطابق شادی سے جوڑ دیا۔ کیونکہ کسی بیوی کے بارے میں پہلے سے کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ وہ زیادہ بچے پیدا کرے گی، تاکہ اسی سے شادی کی جائے؟

سابقہ شوہر سے بچے پیدا کرنے والیوں کو بھی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ سے اولاد پیدا نہیں ہوئی پھر امت کو ایسا غیر عملی مشورہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کیسے دے سکتے تھے؟ جبکہ بیج تو مرد کے پاس ہوتا ہے، یہ حکم تو عورت کو دینا چاہیئے تھا کہ وہ اس مرد سے دوسری، تیسری، چوتھی شادی کرے جس سے پہلی بیوی کو چار پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوں۔

پھر اس روایت سے قوی روایتوں میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کئی کیٹگریز کو اپنی امت سے خارج کر دیا ہے۔ مثلاً "من غشا فلیس منا"۔ جس نے ملاوٹ کی اور ہمیں دھوکا دیا وہ میری امت میں سے نہیں۔ پاکستانی مسلمان ہو کر بھی امتی کم ہی نکلیں گے کیونکہ ہر چیز میں ملاوٹ ہمارا طرہ امتیاز ہے۔ دین تک میں ملاوٹ کر کے ایک ہی دین کے کئی "ورژنز" تیار کر رکھے ہیں اور جن کے پاس خالص ہے ان کا مساجد میں داخلہ ہی منع ہے۔

☆☆☆

شہادتِ حسین توہینِ رسالت ہے

دنیا بھر کے گناہ کر لیجئے، معافی مانگ لیجئے، اللہ معاف کر دے گا۔

مگر قرآن کی رو سے دو جرائم ایسے ہیں جو اللہ کے مطابق ساری نیکیاں ضائع کر دیتے ہیں۔ سورہ البقرہ میں ہے کہ "جو اللہ کی راہ سے لوٹ گیا یعنی مرتد ہو گیا اب اسکی ساری نیکیاں ضائع ہو گئیں، اور دوسرا "قتل" قرآن کے مطابق رسول کائنات صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ بات کر رہے تھے کہ صحابی نے اپنی بات اور وہ بھی اونچی آواز میں شروع کر دی۔ یہ بے ادبی بھی بارگاہِ الٰہی میں ناقابل برداشت ٹھہری۔ اور دائمی آئین میں لکھ دیا کہ بارگاہِ رسالت میں ایسی گستاخی بھی ساری نیکیاں ضائع کر دے گی۔

فرمان رسالت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ ہے کہ:

"حسین مجھ سے ہے اور جس نے سیدہ کائنات سلام اللہ علیہ کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی۔"

مذکورہ بالا فرامین، دین کے مجموعی تناظر اور اہل بیت کی اہمیت کی روشنی میں بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہادتِ حسین علیہ السلام صرف عظیم سانحہ ہی نہیں ناقابلِ برداشت توہینِ رسالت بھی ہے۔

حسین شرح آیات سورۃ رحمٰن
یزید مر گیا اخبار کی خبر کی طرح

سیدنا امام حسین علیہ السلام کی شہادت چونکہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے جوہر شہادت کا ظہورِ تمام تھی اس لیے اِسے شہرت بھی اُسی مقام کی نسبت سے حاصل ہوئی۔

کائنات میں کسی بھی شخص کی عبادت کا چرچا اُس کی شہادت سے پہلے نہیں ہوا جس طرح کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو حاصل ہوا۔ حضرت سفینہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ نے اپنے بعد قائم ہونے والے دورِ حکومت کے بارے میں فرمایا کہ:

”کہ میری امت میں خلافت 30 سال رہے گی اس کے بعد کاٹ کھانے والی ملوکیت ہے۔“(بیہقی، السنن الکبریٰ 5:47، رقم 1855)

چنانچہ حضور نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی پیشن گوئی کے مطابق خلافت تیس برس رہی۔ یہ زمانہ عہدِ خلافتِ راشدہ کہلاتا ہے۔ عہدِ خلافتِ راشدہ کے دوران حضرت علی علیہ السلام کے اعلانِ خلافت کے ساتھ ہی ملکِ شام میں امیرِ شام نے اپنی آزاد حکومت قائم کی اور حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ تسلیم نہ کیا۔ اس پر امتِ مسلمہ متفق رہی ہے کہ خلافت بہر طور سیدنا علی علیہ السلام کا حق تھا۔ آپ ہی خلیفہ برحق اور خلیفہ راشد تھے۔ امیر شام جداگانہ اعلانِ حکومت کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ ان کی کشمکش کا آغاز ہو گیا جس کے نتیجے میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین جیسے چھوٹے بڑے معرکے ہوئے۔ شہادتِ حضرت عمار بن یاسر نے تو فرمانِ رسالت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے مطابق علی علیہ السلام کے حق پر ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

حضور نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی اس پیش گوئی کے مطابق سن 60 ہجری میں قبیلہ قریش کی شاخ بنو امیہ کا اوباش نوجوان یزید بن معاویہ تخت نشین ہوا اور 61 ہجری کے ابتدائی دس دنوں میں سانحہ کربلا پیش آیا۔

یزید تخت نشین ہوا۔ اس کے لئے سب سے اہم اور بڑا مسئلہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت کا تھا کیونکہ ان حضرات نے یزید کی ولی عہدی قبول نہ کی تھی اس سلسلے میں یزید نے مدینہ کے گورنر ولید بن عقبہ کو حضرت امیر شام کی وفات کی خبر بھیجی اور ساتھ ہی یہ حکم نامہ بھیجا کہ:

”حضرت امام حسین علیہ السلام و حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ سے میرے حق میں بیعت لو اور جب تک وہ میری بیعت نہ کریں انہیں ہرگز مت چھوڑو۔(تاریخ الطبری 113)

ولید بن عقبہ رحم دل اور خاندانِ نبوت کی تعظیم و توقیر کرنے والا شخص تھا۔ اس نے اس حکم کی تعمیل پر گھبراہٹ محسوس کی اور اپنے نائب مروان کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ مروان سنگدل اور سخت انسان تھا۔ اس نے کہا میرے خیال میں تم ان حضرات کو اسی وقت بلا بھیجو اور انہیں بیعت کرنے کیلئے کہو، اگر وہ بیعت کر لیں تو ٹھیک ہے ورنہ انکار کی صورت میں تینوں کا سر قلم کر دو۔ (ابن اثیر، 4-15، البدایہ والنھایہ، 8:1417)

سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی حفاظت کا سامان کر کے ولید کے پاس پہنچے۔ اس نے آپ علیہ السلام کو امیر شام کی وفات کی خبر سنائی اور پھر یزید کی بیعت کیلئے کہا۔ آپ علیہ السلام نے تعزیت کے بعد فرمایا: "میرے جیسا بندہ اس طرح چھپ کر بیعت نہیں کر سکتا، اور نہ ہی میرے لیے اس طرح چھپ کر بیعت کرنا مناسب ہے اگر آپ باہر نکل کر عام لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی بیعت کی دعوت دیں تو یہ الگ بات ہے۔"

ولید نے کہا اچھا! آپ تشریف لے جائیں، اس پر مروان نے ولید سے کہا اگر اس وقت تم نے ان کو جانے دیا اور بیعت نہ لی تو تم بھی ان پر قابو نہ پا سکو گے تاوقتیکہ بہت سے لوگ قتل ہو جائیں ان کو قید کر لو، اگر یہ بیعت کر لیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان کا سر قلم کر دو۔ حضرت امام حسین علیہ السلام یہ سن کر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: "ابن الزرقاء تو مجھے قتل کرے گا؟ خدا کی قسم تو جھوٹا اور کمینہ ہے۔" یہ کہہ کر آپ گھر تشریف لے آئے۔

(ابن اثیر، 4:15-10)

بعد ازاں اہلِ کوفہ نے باہم مشاورت سے امام عالی مقام علیہ السلام کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ اہل کوفہ کے مخطوط اور وفود کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام نے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہی کے لئے کوفہ بھیجا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کی بے پناہ عقیدت و محبت کو دیکھتے ہوئے امامِ عالی مقام کو لکھ بھیجا کہ: "آپ علیہ السلام تشریف لے آئیں، یہاں ہزاروں افراد آپ کی طرف سے میرے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔"

چنانچہ امامِ عالی مقام علیہ السلام نے کوفہ جانے کا عزمِ صمیم کر لیا۔ آپ علیہ السلام مکہ معظمہ سے 8 ذی الحجہ کو کوفہ کیلئے روانہ ہوئے۔ راستے میں صفاح کے مقام پر عرب کے مشہور شاعر فرزدق سے آپ علیہ السلام کی ملاقات ہوئی۔ وہ کوفہ سے آرہا تھا۔ فرزدق نے آپ علیہ السلام کو سلام عرض کیا اور دعا دیتے ہوئے کہا:

"اللہ تعالیٰ آپ کی مراد پوری کرے اور آپ کو وہ چیز عطا فرمائے جس کے آپ طلب گار ہیں۔"

حضرت امام حسین علیہ السلام نے پوچھا کہ:

"تمہارے پیچھے لوگوں کا کیا حال ہے۔"

اس نے کہا:

"لوگوں کے دل تو آپ علیہ السلام کے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔"

فرزدق سے ملاقات کے بعد قافلہ حسینی علیہ السلام کوفے کے حالات سے بے خبر کوفہ کی جانب رواں دواں تھا۔ راستے میں ہر چراہ گاہ سے جس پر قافلے کا گزر ہوتا کچھ لوگ ہمراہ ہو جاتے۔ جب قافلہ حسینیہ علیہ السلام "ثعلبیہ" کے مقام پر پہنچا تو حضرت امام حسین علیہ السلام کو حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبر ملی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنا سفر جاری رکھا اور جب آپ علیہ السلام کو ذی حشم کے مقام پر پہنچے تو حر بن یزید جو کہ حکومتِ یزید کی طرف سے آپ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا ایک ہزار سے سواروں کے ساتھ پہنچ گیا اور آپ علیہ السلام کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا اور ابنِ زیاد کا حکم دیا کہ آپ کو لے کر اس کے پاس پہنچوں۔

حضرت امام حسین رضی علیہ السلام اپنے ساتھیوں اور اہل و عیال کے ہمراہ 2 محرم الحرام 61 ہجری بروز جمعرات اپنے ساتھیوں اور اہل و عیال سمیت خیمہ زن ہو گئے۔ خیر نے آپ کے مقابل خیمے نصب کر لئے۔ حر کے دل میں اگرچہ اہل بیت نبوت کی عظمت تھی یہاں تک کہ اس نے اپنی نمازیں بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کے پیچھے ہی ادا کیں تھیں مگر وہ ابنِ زیاد کے حکم سے مجبور تھا۔

جس مقام پر حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے ساتھیوں اور اہل و عیال کے ہمراہ خیمہ زن ہوئے اس دشت و بیابان کی اُداس و مغموم فضا کو دیکھ کر آپ علیہ السلام نے پوچھا:

"اس مقام کا نام کیا ہے؟"

لوگوں نے بتایا کہ:

"اس جگہ کو کربلا کہتے ہیں۔"

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"بس یہیں خیمے لگالو، یہی ہمارے سفر کی آخری منزل ہے۔"

سرزمین کربلا پہنچتے ہی حضرت امام حسین علیہ السلام کو حضور نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے وہ فرامین یاد آرہے تھے جو انہوں نے بچپن میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ سے سُنے تھے کہ میرا بیٹا، میرا حسین سرزمین طف (کربلا) میں شہید کر دیا جائے گا۔ اس لئے جب آپ علیہ السلام کو علم ہوا کہ یہی سرزمین کربلا ہے تو آپ علیہ السلام نے حتمی فیصلہ دیتے ہوئے اس مقام پر ٹھہرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس طرح قافلہ حسینی علیہ السلام غریب الوطنی کے عالم میں کربلا کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ دوسری طرف یزیدی حکومت ان نفوس قدسیہ پر قیامت برپا کرنے کی بھرپور تیاریوں میں مصروف تھی چنانچہ 3 محرم الحرام کو عمر بن سعد چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے کوفہ سے کربلا پہنچا۔

عمر بن سعد نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس قاصد بھیجا کہ آپ کیوں تشریف لائے ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"اہل کوفہ نے مجھے لکھا تھا کہ ان کے پاس آؤں۔ اب اگر وہ مجھ سے بیزار ہیں تو میں واپس مکہ چلا جاتا ہوں۔"

جب ابن سعد کو یہ جواب ملا تو اس نے کہا کہ:

"میری یہ تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی طرح مجھے حضرت امام حسین علیہ السلام کے خلاف جنگ سے بچالے۔"

چنانچہ اس نے ابن زیاد کو یہ بات لکھ بھیجی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اہلِ کوفہ کی ان سے بیزاری پر واپس مکہ جانا چاہتے ہیں لیکن ابنِ زیاد نے جواب دیا کہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دو اور حسین علیہ السلام سے کہو کہ وہ خود اور ان کے ساتھی یزید بن معاویہ کی ان کے بیعت کر لیں۔ جب وہ بیعت کر لیں گے تو ہم سوچیں گے کہ اب کیا کرنا چاہئیے؟ اس پر عمر بن حجاج کی قیادت میں ابن سعد کے آدمیوں نے سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے قافلے پر پانی بند کر دیا۔

9 محرم الحرام 61ھ کو ابن سعد کا دستہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے خیموں کی طرف آیا۔ آپ علیہ السلام نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعے ان سے آنے کا ارادہ معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ امیر ابنِ زیاد کا حکم ہے کہ تم اس کی اطاعت قبول کر لو ورنہ ہم

تمہارے ساتھ جنگ کریں گے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو کہا:

”ان سے کہو کہ ایک رات کی مہلت دے دیں تا کہ اس آخری رات ہم اچھی طرح نماز پڑھ لیں، دعا مانگ لیں اور توبہ استغفار کر لیں۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ مجھے نماز، تلاوت اور دعا و استغفار سے بڑا قلبی تعلق ہے۔“(البدایہ والنہایہ، 8/175)

ابن سعد کے دستہ نے یہ بات مان لی اور قافلہ حسینی علیہ السلام نے رات اللہ تعالیٰ کی عبادت اور مناجات میں بسر کی۔

رفقاء سے سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کا خطاب:

ابن سعد کے دستے واپس لوٹنے کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے رفقاء کو جمع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور حضور نبی اکرم پر درود و سلام کے بعد آپ علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے نہایت فصیح و بلیغ خطاب فرمایا کہ:

”میں کسی کے ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ وفادار اور بہتر نہیں سمجھتا اور نہ کسی کے اہل بیت کو اپنے اہل بیت سے زیادہ نیکوکار اور صلہ رحمی کرنے والا دیکھتا ہوں۔ اللہ تعالی تم سب کو میری طرف سے جزائے خیر عطا کرے گا۔ اگر تم میں سے کوئی جانا چاہتا ہے تو رات کی تاریکی میں چلا جائے۔ بے شک یہ لوگ میرے ہی قتل کے طالب ہیں جب مجھے قتل کریں گے تو پھر کسی اور کی ان کو طلب نہیں ہو گی عمر آپ رضی اللہ عنہ کے اصحاب اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے عرض گزار ہوئے اے نواسہ رسول ہم آپ پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے، ہم اپنی گردنوں پیشانیوں، ہاتھوں اور جسموں سے آپ علیہ السلام کا دفاع کریں گے۔ جب ہم قتل ہو جائیں گے تو سمجھیں گے ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔“(البدایہ والنہایہ، 8/176-177)

آپ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں اور اہل بیت کے جذبات سن کر انہیں اجازت مرحمت فرمائی اور پھر آپ علیہ السلام کے اصحاب نے آپ علیہ السلام کی معیت میں رات بھر نوافل ادا کئے اور بارگاہ ایزدی میں عاجزی و انکساری کے ساتھ مغفرت کی دعائیں مانگیں۔(البدایہ النہایہ 8-177)،(ابن اثیر 4/59)

10 محرم الحرام 61ھ کا خونی آفتاب اپنی پوری خون آشامیوں کے ساتھ طلوع ہوا حسینی فوج کے 72 پر سالاروں نے یزیدی فوج کا ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یزیدی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ اس طرح مُٹھی بھر جانثاران حسین علیہ السلام پروانہ وار شمع امامت پر قربان ہونے لگے۔ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ علیل تھے۔ علالت کے باوجود اپنے والد گرامی سے اجازت طلب کی مگر آپ علیہ السلام نے سمجھایا کہ ایک تو آپ رضی اللہ عنہ علیل ہیں اور دوسرا آپ رضی اللہ عنہ کا زندہ رہنا ضروری ہے کیونکہ خانوادہ رسول کا ہر چراغ گل ہو چکا ہے، ہر پھول مرجھا چکا ہے، اب میری نسل میں فقط تو ہی باقی رہ گیا، مجھے تو شہید ہونا ہی ہے اگر تو بھی شہید ہو گیا تو میرے نانا کی نسل کیسے چلے گی۔ تجھے اپنے نانا کی نسل کی بقاء کے لئے زندہ رہنا ہے پھر آپ رضی اللہ عنہ کو کچھ نصیحتیں کیں اور یوں فرزند صاحبِ ذوالفقار حضرت امام حسین علیہ السلام حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر خود میدان کربلا میں اترے۔ پورے یزیدی لشکر میں کہرام مچ گیا۔ حیدر کرار کا یہ فرزند جس طرف تلوار لے کر نکلتا یزیدی لشکر خوفزدہ بھیڑوں کی طرح آگے بھاگنے لگتا۔

اسی معرکہ کے دوران آپ علیہ السلام کو بہت پیاس لگی، آپ علیہ السلام نے پانی کے لئے دریائے فرات کا رخ کیا مگر دشمن سخت مزاحمت کرنے لگا، اچانک ایک تیر آپ علیہ السلام کے چہرہ مبارک پر لگا اور آپ علیہ السلام کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا۔ آپ علیہ السلام نے تیر کھینچ کر نکالا پھر ہاتھ چہرے کی طرف اٹھائے تو دونوں چُلّو خون سے بھر گئے۔ آپ علیہ السلام نے اپنا خون آسمان کی طرف اچھال دیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا:

"الٰہی میرا شکوہ تجھی سے ہے، دیکھ تیرے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے نواسے کے ساتھ کیا برتاؤ ہو رہا ہے۔" (الطبری 6۔33)

حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام دن کا طویل حصہ میدان کربلا میں تنہا دشمن کا مقابلہ کرتے رہے اور دشمنوں میں سے ہر کوئی آپ علیہ السلام کے قتل کو دوسرے شخص پر ٹالتا رہا کیونکہ حسین علیہ السلام کا قتل کوئی بھی اپنے ذمہ نہ لینا چاہتا تھا۔ آخر شمر بن ذی الجوشن نے کہا:

"تمہارا برا ہو کیا انتظار کر رہے ہو؟ کام تمام کیوں نہیں کرتے؟"

آپ علیہ السلام ہر طرف سے نرغہ ہوئے۔ آپ علیہ السلام نے پکار کر کہا:
"کیا میرے قتل پر ایک دوسرے کو ابھارتے ہو، میرے بعد کسی بندے کے قتل پر اللہ تعالیٰ اتنا خوش نہیں ہو گا جتنا میرے قتل پر۔" (ابن اثیر، 4/78)

شمر لعین کے اکسانے پر یزیدی لشکر آپ علیہ السلام پر ٹوٹ پڑا، زرعہ بن شریک سیمی نے آگے بڑھ کر آپ علیہ السلام کے بائیں کندھے پر تلوار ماری جس سے آپ علیہ السلام لڑکھڑا گئے۔ اس پر سب حملہ آور پیچھے ہٹے پھر سنان بن ابی عمرو بن انس نے آگے بڑھ کر آپ علیہ السلام کو نیزہ مارا جس سے آپ علیہ السلام گر پڑے۔ سنان نے سواری سے اتر کر آپ علیہ السلام کا سر تن سے جدا کر کے خونی یزید کے حوالے کر دیا۔ (البدایہ والنہایہ، 8/188)

حسین تم نہیں رہے تمہارا گھر نہیں رہا
مگر اس کے بعد کسی ظالم کا ڈر نہیں رہا

تو یوں اس جگر گوشہ بتول سیدنا امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے میدان میں جانثاری کی ایک نئی تاریخ رقم کر کے قربانی کی ایک لازوال مثال قائم کر دی اور رہتی دنیا تک یہ پیغام دے دیا کہ باطل کے خلاف حق کی سربلندی کے لئے اگر سر تن سے جدا بھی ہو تا ہے تو پرواہ نہ کی جائے اور قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔

اس سانحہ کو قید زمین و مکاں نہیں
اک درس دائمی ہے شہادت حسین کی
یہ رنگ وہ نہیں جو مٹانے سے مٹ سکے
لکھی گئی ہے خوں سے امامت حسین کی

☆☆☆

عورت اک معمہ ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا

(دنیابھر کی تمام خواتین سے انتہائی معذرت کے ساتھ)

اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ تمام تر مخلوقات میں سے عورت شاید وہ واحد تخلیق ہے کہ جس کو مکمل طور پر سمجھنا تقریباًنا ممکن ہے۔ عورت وہ گتھی ہے جسے مرد روزِ اوّل سے سلجھانے کی کوشش کر رہاہے مگر بیچارہ آج تک اس کام میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ انسان نے انواع واقسام کے چرند پرند، آبی حیات، کیڑے مکوڑوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کیا پھر تیقن سے بتایاہے کے فلاں فلاں مخلوق کسی خاص قسم کے ماحول یاصورتحال میں کس قسم کاردِ عمل ظاہر کرے گی۔ تقریباًہر جاندار کازندگی گزارنے کاایک مخصوص طریقہ کارہے جو انسان جان چکاہے اور اس کے بارے میں پیشگی بتاسکتاہے۔اسی طرح ایک مرد کے بارے میں بھی بڑی آسانی سے بتایاجاسکتاہے کے وہ کس طرح سوچتاہے اور کیسے اپنی سوچ پر عمل پیراہوتاہے۔

مگر حیرانگی کی بات یہ ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ذہین سے ذہین اور قابل سے قابل مرد بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ کسی بھی دیے ہوئے وقت میں ایک عورت کے ذہن میں سوچ وبچار کا عمل آخر کس اصول پر چل رہاہوتاہے؟ اور جو کچھ اُس کے ذہن میں چلتاہے اُس بات کااُس عورت کی زبان سے کسی قسم کاکوئی ربط ہوتا بھی ہے کہ نہیں؟ کہتے ہیں آج کا انسان اپنی تمام تر ترقی کے باوجود اپنے ذہن کا صرف 10 فیصد استعمال کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں تو جن سائنسدانوں نے یہ مشاہدہ کیاہے اُنہوں نے اپنے نمونوں میں عورت کو شامل ہی نہیں کیاورنہ وہ اس قدر غلط نتیجہ کبھی نہ اخذ کرتے کیونکہ عورت کاذہن ایک مرد کے مقابلہ میں بھی کئی گنازیادہ فعال ہوتاہے۔

بظاہر ایک ہی طرح کی ہیئت کی حامل یہ دونوں مخلوقات (مرد و عورت) اپنی اپنی سوچ کے اعتبار سے انتہائی مختلف ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کے دونوں کے درمیان قطبین کا فاصلہ ہے تو بے جا نا ہو گا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد کا ذہن عورت کی دماغی صلاحیتوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ مرد عام جانداروں کی طرح ایک وقت میں ایک ٹریک پر سوچتا ہے اور جو وہ سوچتا ہے اُسی کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ جبکہ عورت کا دماغ بالکل مختلف طریقہ پر کسی سُپر کمپیوٹر کی طرح کام کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ بیک وقت ایک سے زیادہ اُمور پر سوچنے میں مہارت رکھتا ہے (یعنی ملٹی ٹاسکنگ) بلکہ ایک عورت کا جسم ایک مرد کے جسم کی طرح اپنے دماغ کا غلام بھی نہیں ہوتا۔ ایک مرد کا دماغ جب حکم دیتا ہے تو جسم اس کی فوراً ہی تعمیل شروع کر دیتا ہے اور پورے جی جان سے کرتا ہے۔

جیسا کہ دماغ اُسے دفتر سے گھر آنے پر حکم دیتا ہے: ”صوفے پر بیٹھ جاؤ اور ٹی وی دیکھو“ تو مجال ہے ایک مرد کی کہ وہ رات گئے تک ہل کر کوئی اور دوسرا کام تو کر لے! مگر یہ بالکل بھی ضروری نہیں کہ عورت کا کوئی عمل اُس کے اپنے دماغ کے تابع ہو۔ قدرت نے عورت کو اس صلاحیت سے نوازا ہے کہ وہ بیک وقت اپنے جسم، زبان اور دماغ کو الگ الگ حیثیت میں استعمال کرنے پر قادر ہوتی ہے۔ یعنی بیک وقت وہ سوچ کچھ رہی ہوتی ہے، بول کچھ رہی ہوتی ہے اور عمل کچھ اور ہی کر رہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر غصہ اُسے ساس پر ہوتا ہے، بچے کو وہ کسی اور بات پر پیٹ رہی ہوتی ہے اور سنا شوہر کو کچھ اور ہوتی ہے۔۔۔ سبحان اللہ!

کبھی آپ نے کسی میاں بیوی کی گفتگو پر غور کیا ہو تو آپ اقرار کریں گے کہ بات کچھ اس طرح ہوتی ہے:

شوہر: چھوٹے کے اسکول سے شکایت آئی ہے کہ آج کل وہ پڑھائی پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہا۔ ہوم ورک بھی پورا کر کے نہیں لے جاتا۔

بیوی: ہاں! اُن کی ٹیچر کا تو دماغ خراب ہے۔۔۔ آپ نے گل احمد والوں کی نئی لان دیکھی؟ بالکل بیکار ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے میری امی کے پاؤں میں شدید درد ہے۔۔۔ آپ کو اپنے لیے شلوار قمیض تو نہیں چاہیے؟

بادی النظر میں یہ ان چاروں جملوں کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں لیکن یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ خواتین کی اس قسم کی تمام کی تمام گفتگو نا صرف یہ کہ اچھی طرح مربوط ہوتی ہے بلکہ اُس کا ایک گہرا مقصد بھی ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مرد کی عقل اُس اعلیٰ مقام تک پہنچ ہی نہیں پاتی کہ جہاں سے عورت کا ذہن چلنا شروع ہوتا ہے۔ اب اُوپر دی گئی مثال کو ہی سمجھنے کی کوشش کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بیوی نے دراصل کہا کیا ہے!

بیوی: ''بچوں کی پڑھائی کا ٹھیکہ ایک اکیلے میں نے نہیں لیا ہوا۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو آپ اُسے حل کیوں نہیں کرتے؟ بچوں کو کھلانا پلانا، نہلانا دھلانا، اوڑھنا، پہنانا، جگانا، سلانا کوئی آسان کام ہے کہ اب میں انہیں اچھی طرح سے پڑھاؤں بھی؟ میرے پاس ان کاموں کے لیے اب مزید وقت نہیں ہے۔ اور ہاں! کل امی نے مجھے گھر بلایا ہے اور میں اُن کی طرف جاتے ہوئے راستے سے اپنے لیے جے ڈاٹ کا سوٹ پیس لینے جاؤں گی کیونکہ گل احمد کی لان پہن پہن کر اب میرا دل بھر چکا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ اپنے شلوار سوٹ کے لیے منع ہی کریں گے اس لیے میں نے ویسے ہی پوچھ لیا ہے تا کہ آپ امی کے گھر جانے اور سوٹ خریدنے پر کوئی اعتراض نا کریں۔''

اس پر عورت کا بڑا پن دیکھیے کہ وہ اپنی پہیلی جیسی باتوں کے جواب میں ایک مرد سے بہت کچھ سننا بھی نہیں چاہتی بس ایک 'ہاں' اُس کے لیے کافی ہے۔ بصورت دیگر آپ یوں سمجھیں کہ آپ نے طبلِ جنگ بجا دیا ہے اور پھر شکست تسلیم کر لینے تک آپ میدانِ کارزار میں صرف اور صرف نوک دار باتوں سے زخمی ہی ہوتے رہیں گے۔ ساتھ ہی اپنا خون جلانے کے ساتھ ساتھ اُسے پیتے بھی رہیں گے۔ دوسری طرف اگر آپ عورت کی خواہش کے عین مطابق ''ٹھیک ہے'' کہہ کر چپ ہو جائیں تو بات ختم بھی ہو سکتی ہے لیکن اگر بیگم کا موڈ خراب ہے تو پھر آپ پر ایک دوسرا الزام یہ بھی لگ سکتا ہے کہ آپ تو سیدھے مُنہ بات ہی نہیں کرتے!

بیوی کے جملوں کا مفہوم سمجھنا ایک فن ہے جو ہر شوہر بالخصوص نئے نویلے شوہروں کے بس کی بات نہیں۔ مندرجہ ذیل میں ہم نے بیویوں کے روزمرہ استعمال کے چند جملے تحریر کر دیے ہیں جن کو اگر شوہر حضرات یاد رکھیں تو اِن کے درمیان کی بات چیت میں جو خلا آ جاتا ہے وہ باآسانی پُر کیا جا سکتا ہے:

لفظ: شاید- مطلب: نہیں
لفظ: نہیں- مطلب: بالکل نہیں
لفظ: اچھا- مطلب: سن لیا ہے اب کوئی اور بات کریں
جملہ: ہو سکتا ہے- مطلب: نہیں ہو سکتا
جملہ: ٹھیک ہے- مطلب: ٹھیک نہیں ہے
جملہ: ہاں ہاں یہ میری ہی غلطی ہے- مطلب: بس ہر الزام مجھ پر ہی لگا دیا کریں آپ۔
جملہ: جیسے آپ کی مرضی۔ مطلب: بحث مت کریں اور جو میں کہہ رہی ہوں وہ کریں۔
جملہ: مجھے افسوس ہے۔ مطلب: جلد ہی آپ کو افسوس ہو گا۔
جملہ: مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ مطلب: مجھے آپ سے شکایت کرنی ہے۔
جملہ: جو آپ بہتر سمجھیں۔ مطلب: اس بات کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔
جملہ: اب آپ ہی فیصلہ کریں۔ مطلب: میں جو اتنی دیر سے کہہ رہی ہوں وہ سمجھ نہیں آیا ابھی تک؟
جملہ: ٹھیک ہے بولیں۔ مطلب: میں کہتی ہوں خاموش رہیں مجھے کچھ نہیں سننا!
جملہ: ہمیں چاہیے۔۔۔- مطلب: مجھے چاہیے۔۔۔
جملہ: کھانا اچھا نہیں پکایا؟ مطلب: تعریف کیوں نہیں کی ابھی تک؟
جملہ: میں کیسی لگ رہی ہوں؟ مطلب: میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہوں؟
جملہ: میں بس ابھی تیار ہو کر آئی۔ مطلب: تین گھنٹے انتظار کریں!
جملہ: مجھے نیا سوٹ لینا ہے۔ مطلب: مجھے نیا سوٹ، نیا پرس، نئی سینڈل، نئی جیولری، نئی لپ اسٹک، نئی نیل پالش، نیا مسکارا، وغیرہ لینا ہے۔
جملہ: کیا آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں؟ مطلب: مجھے کوئی بہت مہنگی چیز چاہیے۔
جملہ: آج آپ بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں۔ مطلب: آج شاپنگ پر چلیں؟
جملہ: آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟ مطلب: میں نے آج کوئی بڑی غلطی یا نقصان کر دیا ہے۔
جملہ: مجھے کچھ دیر اکیلا چھوڑ دیں۔ مطلب: میں آپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔
جملہ: میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ مطلب: آپ مجھ سے بات مت کریں اور برائے مہربانی یہاں سے چلے جائیں۔

جملہ: میں نے ابھی جو کہا وہ سنا آپ نے ؟ مطلب: کیا آپ بہرے ہو گئے ہیں ؟

جملہ: نہیں، میں غصہ میں تو نہیں! مطلب: کیا آپ نابینا ہیں ؟ نظر نہیں آرہا میں کتنے غصہ میں ہوں اس وقت ؟

جملہ: آپ میری بات نہیں سن رہے نا؟ مطلب: ٹھیک ہے بچو! اب میں آپ کو بتاتی ہوں۔

جملہ: اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ مطلب: جب میرا غصہ ٹھنڈا ہو گا تب بات کریں گے۔

جملہ: کوئی آواز سنی آپ نے ؟ مطلب: یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں جایئے جا کر چیک کیجیے۔

جملہ: ناشتے میں کیا کھائیں گے ؟ مطلب: جو ناشتہ کرنا ہے صبح خود ہی کر لیجیے گا۔

جملہ: رات کا کھانا کیا پکے گا؟ مطلب: آج کہیں باہر نہ کھائیں ؟

جملہ: چھوٹو کا گلا خراب لگ رہا ہے۔ مطلب: کل اسکول کی چھٹی کروادوں ؟

جملہ: میں بوڑھی لگ رہی ہوں ؟ مطلب: آپ اس بات کی تائید کریں کہ میں اب بھی خوبصورت دِکھتی ہوں۔

اسی طرح اگر آپ بیگم سے پوچھیں کے ''کیا کوئی مسئلہ ہے آج مُوڈ آف لگ رہا ہے ؟'' تو جواب آئے گا: کچھ نہیں! جس کا اصل مطلب ہے: آپ دوبارہ پوچھیں۔ دوبارہ پوچھیں تو جواب آئے گا: کہا تو ہے کچھ نہیں! اس کا مطلب ہے تیسری بار پھر پوچھیں۔ اور پھر پوچھنے پر جواب آئے گا: اوہ ہو! آپ تو ایک ہی بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا اصل مطلب یہ ہے ابھی مزید ایڑیاں رگڑیں! یعنی آپ بار بار پوچھتے جائیں اور یوں بالآخر کئی بار پوچھنے پر بتایا جائے گا کہ دراصل مسئلہ ہے کیا، اور مسئلہ بھی وہ جو عموماً سسرال سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

عورت کا اپنے شوہر کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت اپنے شوہر میں کئی صفات دیکھنا چاہتی ہے۔ مثال کے طور پر عورت چاہتی ہے کے اُس کا شوہر شکل و صورت میں اُس کے خوابوں کا شہزادہ نہیں تو کم از کم اُس کا کوئی قبول صورت درباری ضرور ہو لیکن بات جب اُسی شخص کی سیرت کی آئے تو وہ اُسے کسی شہزادے کی نہیں بلکہ عین اُس کے اپنے پُر شفیق باپ کی طرح سے چاہیے۔

اب آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں کہ کوئی خوبصورت شہزادہ کبھی شفیق نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی شفیق باپ کبھی خوبصورت ہوا ہے مگر عورت کو تو ہر صورت اِگلُو کی ٹُو اِن وَن آئس کریم چاہیے۔

دوسری جانب وہ ایک مرد کی شخصیت کے ایک ہی پہلو میں ایک خوبی اپنے لیے چاہتی ہے اور ایک اُس سے مختلف دوسروں کے لیے یعنی شوہر مادیت پسند نہ ہو مگر متمول ضرور ہو۔ غصہ والا نہ ہو مگر رعب دار ضرور ہو۔ اُس میں حسِ مزاح تو ہو مگر سنجیدہ مزاج ہو۔ وہ نرم خُو بھی ہو اور ساتھ ہی ایک مضبوط شخصیت کا بھی حامل ہو۔ حقیقت بھی ہو مگر ساتھ ہی رومینٹک بھی ہو۔ الغرض وہ اپنے لیے ایک ایسا مردِ کامل چاہتی ہے جو تضادات کا مجمع ہو بلکہ دراصل چُوں چُوں کا مربہ ہو اور ہر وقت یہ سننے کے لیے بھی تیار رہے کہ "تم نے میرے لیے کیا ہی کیا ہے۔" اب ایسا مُنجن اللہ تعالیٰ پیدا ہی نہیں فرماتا تو اس میں مرد کا بھلا کیا قصور ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

نفاذِ اُردو کے داعیان کے نام!

میرے نزدیک نفاذِ اردو کی کوئی مہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اردو فیشن کی طرح رائج نہیں ہوتی جس کے لیے کوئی قانون سازی یا مصنوعی مہم نہیں چلائی جا سکتی اور نا ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔

نفاذِ اردو سے قبل ایک اور اہم سوال ہے کہ کیا ہمارے ہاں جو اردو رائج ہے (خصوصا بولنے کی حد تک) کیا اسے اردو ہی کہا جائے گا؟

قندھار سے کوئی نیم خواندہ پٹھان لاہور آ کر چند دن اصلاحِ جُفت کا کام کرتا ہے اور اردو بولنا شروع کر دیتا ہے۔ اور ایسی ہی اردو ہمارے ہاں پڑھے لکھے لوگ بولتے اور لکھتے ہیں۔

اس سے اہم سوال ایک اور بھی ہے دو عناصر سے دنیا کا ہر مذہب شکست کھا چکا ہے ایک ثقافتی اور دوسرا دانستہ نہیں لکھ رہا۔

دنیا کے کسی ایک کونے سے ایک نظریہ اٹھتا ہے اور دوسرے کونے میں لوگ اسے قبول کر لیتے ہیں زبان، رہن سہن، موسیقی، رسوم و رواج اور کھانے پینے کے ذائقے یوں تبدیل یا نافذ نہیں کیے جا سکتے۔

ہمارے ہاں بھی حجاز سے آیا دین لوگوں نے بخوشی (بعض دیگر اہم وجوہ بھی ہیں) قبول کر لیا، لیکن کلچر قبول نہیں کیا اور نا کبھی کریں گے۔ دیگر قطعات دنیا میں بھی یہ ہی چلن ہے۔

کلچر ہمیشہ کسی رائج کلچر کو قبول کرتا ہے۔

جیسے ہمارے ہاں مغربی لباس رائج ہے چونکہ مغربی لباس دنیا بھر میں رائج الوقت ہے اور تب تک رائج رہے گا جب تک کسی اور کلچر کا سکہ نہیں چلتا۔

بد قسمتی سے ہمیں یہ سمجھنے میں اس لیے مشکل پیش آ رہی ہے کہ احساس کمتری نے ہمیں دفاعی پوزیشن میں کھڑا کر رکھا ہے۔

بد قسمتی سے جہاں ہم ہزاروں سال سے آباد ہیں ہم نے اسے ہندوستانی کلچر سمجھنے کے بجائے "ہندو کلچر" سمجھ لیا ہے۔ اور نیم خواندہ مولوی نے اسے مذہب سے جوڑ دیا ہے۔

اگر آپ اسلام کو ہی مثال بنالیں اور غور کریں کہ اسلام کا نظریہ اپنے آفاقی اور حقیقی پیغام کی وجہ سے دنیا کے کونے کونے میں پھیل گیا لیکن عربی لباس، کھجور، عربی زبان اور رہن سہن کہیں رائج نہیں ہو سکا۔

یہ درست ہے کہ اردو زبان کو دفتری اور رابطے کی زبان ہونا چاہیے لیکن یہ مہم جوئی سے نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆

سفر پر نکلو

سفر پر نکلو
ورنہ تم نسل پرست بن کے رہ جاؤ گے
اور تم اسی ایمان و گمان کے دائرے میں مقید رہو گے
کہ گویا صرف اور صرف تمہاری چمڑی کا رنگ ہی حق ہے
اور یہ کہ بس تمہاری ہی زبان رومانوی ہے۔
اور یہ کہ بس تم ہی اوّلین تھے اور تم ہی اوّل رہو گے
سفر پر نکلو
کیونکہ اگر تم سفر نہیں کرتے
تو تمہارے خیالات کو مضبوطی نصیب نہیں ہو سکے گی
اور تمہارے خیالات کی جھولی عظیم ترین نظریات سے لبریز نہ ہو سکے گی
تمہارے خواب کمزور، ناتواں
اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ جنم لیں گے
اور پھر تمہارے یقین کا مرکز و محور ٹیلی ویژن شو ہی رہ جائیں گے
یا پھر وہ لوگ کہ جو درندہ صفت دشمنوں کی ایجاد و کاشت کرتے ہیں
جو تمہارے ڈراؤنے خوابوں سے ہم آہنگ ہوں گے
تاکہ تم اگر جیو بھی تو ایک گہرے خوف کے ساتھ
سفر پر نکلو
کیونکہ سفر تم کو بغیر اس تفریق کے

کہ ہم کس خطے کے باسی ہیں
تمہیں ہر ایک کو" صبح بخیر" کہنے کی طاقت سے سرشار کردے گا
سفر پر نکلو
کیونکہ سفر اس فرق کے بغیر کہ ہم
کون کونسے اندھیرے اپنے من میں لئے پھرتے ہیں
ہر ایک کو"شب بخیر" کہنے کی غنائیت سے سرفراز کردے گا
سفر پر نکلو
ورنہ تمہارا ایمان و نظر بجائے اسکے کہ تمہارے اندرونی مناظر کی سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو
ایک ہی بیرونی منظر کا قیدی رہے گا
(اٹلی کے عظیم شاعر گایو آیون کی نظم کا اردو ترجمہ)

☆☆☆

وائٹ ہاؤس میں فری لنچ

(چیف آف ڈیفنس فورسز، چیف آف آرمی سٹاف اور فیلڈ مارشل
"جنرل عاصم منیر" کی امریکی صدر "ڈونلڈ ٹرمپ" کی وائٹ ہاؤس میں
پہلی ملاقات کے تناظر میں لکھا گیا کالم)

فیلڈ مارشل عاصم منیر آج ٹرمپ کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں لنچ کر رہے ہیں۔ انگلش میں کہتے ہیں کہ "There is no free lunch" یعنی اس طرح کی میٹنگز کی کوئی نہ کوئی قیمت ضرور ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس پر تجزیہ نگار کھل کر بات کرنے کو تیار نہیں ہیں حالانکہ بات سب کو معلوم ہے۔ امریکہ پاکستان سے براہ راست ایران میں رجیم چینج آپریشن کے حوالے سے تعاون مانگے گا۔ باقی تمام موضوعات غیر اہم ہیں۔ اسی ایک نقطے پر بحث ہو گی کہ کس حد تک پاکستان صیہونی ریاست کی ایران پر دہشت گردی کی حمایت کر سکتا ہے۔

پاکستان اس کے بدلے امریکہ سے کیا مانگے گا؟ معدنیات کی ڈیل، معاشی امداد، فوجی امداد، اور عمران خان، انسانی حقوق اور عدالت سے صرفِ نظر۔ اگر ایسا ہو گیا تو ان اس خطے میں، خصوصی طور پر پشتون بیلٹ میں مسلسل ڈالر زدہ جنگیں مزید تیز ہوں گی اور عوام تباہ حال ہوں گے جبکہ چند لوگوں کے حصے میں حسبِ معمول "پاپا جونز" آئیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم مستقل طور پر چین، جس کی مدد سے ہم نے بھارتی جارحیت کو شکست دی تھی، کو ناراض کر دیں گے۔ کوئی ملک یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ جب ایک سامراجی ملک خطے پر حملہ آور ہو اور اس کے خلاف محاصرہ تیز کر رہا ہو تو اس کا اپنا "اتحادی" اسی سامراجی ملک کے ساتھ ڈیل کر لے۔ یعنی ہم امریکی کیمپ میں جا کر اپنے خطے کے خلاف ایک بار پھر "فرنٹ

لائن سٹیٹ"بن جائیں گے اور ہمارے حکمران صیہونی اور سامراجی جارحیت سے بننے والے کھنڈرات پر حکمرانی کرنے کو اعزاز سمجھیں گے۔

ان حالات میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ پاکستان کے حکمران طبقے کے اندر اس سوال پر ایک تقسیم موجود ہے۔ کل خواجہ آصف نے ٹویٹر پر رضا پہلوی کو جو گالیاں دیں (جن کا اردو میں ترجمہ بھی نہیں کیا جاسکتا) وہ صرف غصے کا اظہار نہیں بلکہ ایک رجحان کی عکاسی کرتا ہے جو اس وقت امریکی کیمپ سے نکلنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی نظریاتی رجحان نہیں بلکہ ہر رجحان کی طرح اس کے اپنے مفادات ہیں جس میں خصوصی طور پر چین اور روس کے ساتھ بہتر تعلقات کی بنیاد پر وہ معاشی ترقی اور دفاعی قوت بڑھانا چاہتا ہے۔ یہ کشمکش آنے والے دنوں میں معاشرے کے ساتھ ساتھ ریاست کے اندر بھی شدید تضادات پیدا کرے گی کیونکہ اب بڑے فیصلے کی گھڑی آ گئی ہے۔

میری اپنی رائے اس پر واضح ہے۔ امریکہ اور چین میں سے ہمیں ہر حال میں چین کا انتخاب کرنا چاہئے۔ وہ لوگ جو "چینی سامراج" کے نعرے لگاتے تھے، انہیں ٹی وی لگا کر دیکھنا چاہئے کہ سامراج کیا ہوتا ہے۔ پورے ملکوں کو تباہ کرنا، نسل کشی کرنا، پابندیاں لگانا اور رجیم چینج آپریشن کرنا، یہ سامراج ہے۔ اور یہ امریکہ نے پہلی بار نہیں، سو سے زائد ممالک کے ساتھ ماضی میں کیا ہے۔ چین کے کردار پر بحث ہو سکتی ہے لیکن ان حالات میں امریکہ اور چین میں مماثلت تلاش کرنا کم عقلی اور بددیانتی کے سوا کچھ نہیں۔ آج امریکی کیمپ کا مطلب مسلسل جنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں کیونکہ امریکہ ابھی رُکے گا نہیں۔ ایران کی طرح وہ روس اور چین کی تباہی بھی چاہے گا۔ اور ایک دن باری پاکستان کی بھی آئے گی اور ہمیں بچانے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔

پاکستان میں اگر کوئی بہترین انقلابی حکومت بھی آجائے گی، تب بھی اسے اِنہی معروضی حالات کا سامنا ہو گا۔ سامراجی حملے کے وقت اگر چین یا دیگر ممالک کا کیمپ موجود نہ ہو تو اسرائیلی اور امریکی ٹیکنالوجی کے آگے انقلابی حکومت کیا کرے گی؟ چین کے ساتھ کیمپ میں جانے سے بھی ہمارے مسائل حل نہیں گے۔ ہمیں چین کے ساتھ اقتصادی معاہدوں کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے، طبقاتی بنیادوں پر وسائل کی تقسیم کی ضرورت ہے اور پسماندہ علاقوں کے لئے بہتر پیکیج حاصل کرنے کی بھی ضرورت۔ یہ سب طبقاتی، جمہوری اور

نظریاتی جدوجہد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لیکن امریکی کیمپ میں ہم چلے گئے تو صرف اور صرف نا ختم ہونے والی جنگیں ہمارا مقدر بنیں گی جس میں پورا خطہ تباہ ہو جائے گا اور مار دھاڑ سے چند جرنیل پیسہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پاکستان کی سالمیت اور ہمارے سیاسی اور تہذیبی وجود کا تقاضا ہے کہ ''ڈالری جنگوں'' کو رد کریں اور اپنے خطے کے ساتھ مخلص رہیں۔

پاکستان ایک تاریخی پر موڑ ہے۔ ایران مین صیہونی اور سامراجی بربریت ہمیں بتا رہی ہے کہ ہمارے سماج کو تباہ کرنے اور اس پر رضا پہلوی جیسے وطن فروشوں کو مسلط کرنے کا منصوبہ تیار ہے۔ وہ قوتیں جو امن، ترقی اور مساوات دیکھنا چاہتی ہیں، ان پر فرض ہے کہ وہ وطن فروشوں کی چالوں سے آگاہ رہیں۔ ہمیں تیسری دنیا کے دیگر ممالک سے سیکھ کر ایک وسیع پیمانے پر سامراج مخالف تحریک بنانے کی ضرورت ہے، جو ملک بھر سے نوجوانوں کو ذہنی طور پر بیرونی حملہ آوروں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کے خلاف جدوجہد کے لئے تیار کرے۔

فیلڈ مارشل صاحب بھی جان لیں کہ ان کے لنچ کی قیمت پاکستانی عوام اپنے خون سے ادا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ صیہونیت کے آگے جھکنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ وطن یا کفن! اسی نعرے کے ساتھ اپنی زمین، تہذیب اور خطے کا دفاع ہم سب پر لازم ہے۔

☆☆☆

804 صرف تاریخ رقم کرے گا ورنہ۔۔۔!

جب چی گویرا کو ایک چرواہے کی اطلاع پر پکڑا گیا تو کسی نے چرواہے سے پوچھا :
"تم نے اس شخص کے خلاف کیوں اطلاع دی جو تمہارے اور تمہارے حقوق کے لیے لڑتا تھا؟"

چرواہے نے جواب دیا :
"ان کی بندوق کی ٹک ٹک سے میری بکریاں ڈرتی تھیں!"

اسی طرح جب مصر کے عظیم مجاہد محمد کریم نے فرانسیسی افواج کے خلاف مزاحمت کی اور پکڑے گئے تو نپولین نے انہیں سزائے موت سنائی، مگر بعد میں بلوا کر کہا:
"مجھے افسوس ہے کہ میں تم جیسے بہادر مجاہد کو پھانسی دوں جو اپنے وطن کے لیے لڑا۔ میں نہیں چاہتا کہ تاریخ مجھے ایسے ہیروز کے قاتل کے طور پر یاد رکھے۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں، بشرطیکہ تم میرے مارے ہوئے فوجیوں کے عوض دس ہزار سونے کے سکے ادا کرو۔"

محمد کریم نے جواب دیا :
"میرے پاس اتنی رقم نہیں، لیکن تاجروں پر میرا ایک لاکھ سے زائد سونے کے سکوں کا قرضہ ہے۔"

نپولین نے انہیں مہلت دی کہ وہ رقم وصول کر لیں۔ محمد کریم ہتھکڑیاں پہنے اور فرانسیسی فوجیوں کے بیچ بازار گئے، مگر ان کے اپنے ہی لوگوں نے ان کی مدد نہ کی۔ کسی تاجر نے قرضہ ادا نہ کیا، بلکہ انہیں الٹا اسکندریہ کی تباہی اور معیشت کے گرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ مایوس ہو کر وہ نپولین کے پاس لوٹے، تو اس نے کہا :

”اب میرے پاس تجھے پھانسی دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ نہ صرف اس لیے کہ تم نے ہماری مزاحمت کی، بلکہ اس لیے بھی کہ تم نے اتنے بزدلوں کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی جو اپنی تجارت کو وطن کی آزادی پر ترجیح دیتے ہیں۔“

اس پر علامہ سید رشید رضا نے کہا تھا :

”جاہل معاشرے کے لیے قربانی دینا ایسے ہے جیسے کوئی اپنے جسم کو جلا کر راستہ روشن کرے، مگر سامنے اندھا کھڑا ہو۔“

لہٰذا بزدلوں کے لیے کبھی بھی نہیں لڑنا چاہیے!

☆☆☆

فروغ تعلیم میں نجی اداروں کا ناگزیر کردار

پاکستان میں تعلیم کا شعبہ ہمیشہ سے ایک پیچیدہ اور متنازعہ موضوع رہا ہے، اور اگر پاکستان کے بنیادی مسائل پر بات کی جائے تو سب سے انحطاط پذیر شعبہ بھی تعلیم ہی ہے جس کے بد اثرات بھی پاکستان کے ہر شعبے اور معاشرے میں نظر آتے ہیں۔ پاکستان کے ہر سرکاری ادارے کی طرح سرکاری تعلیمی اداروں کی ناقص کارکردگی بھی پالیسیوں میں عدم تسلسل اور وسائل کی کمی کے باعث دگرگوں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید دنیا میں حکومت فیکٹریاں اور ادارے نہیں چلاتی اور نہ چلا سکتی ہے۔ بلکہ مانٹرنگ کرتی ہے اور جہاں ممکن ہو پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بنیادی صحت اور بنیادی تعلیم ہم تک پہنچانا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے مگر بدقسمتی سے ہر شعبے کی طرح پاکستان مین سرکاری سطح پر قائم تعلیمی اور صحت کے ادارے معدودے چند کے علاوہ زبوں حالی کا شکار ہیں۔

ایسے میں نجی تعلیمی ادارے گزشتہ تین دہائیوں میں تیزی سے فروغ پا رہے ہیں۔ آج کے دور میں یہ ادارے پاکستان کے تعلیمی نظام کا ایک ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔ تاہم، ان کا کردار کئی حوالوں سے انتہائی قابلِ تعریف ہے اور بعض حوالوں سے قدرے تنقید بھی کی جاتی ہے۔

پاکستان میں تعلیم کی شرح خواندگی تقریباً 59.3 فیصد ہے، جو جنوبی ایشیائی ممالک میں سب سے کم ترین شرحوں میں شمار ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق پاکستان میں تقریبا 2 کروڑ 67 لاکھ بچے اسکولوں سے باہر ہیں، جو دنیا میں اسکول نہ جانے والے بچوں کی دوسری سب سے بڑی تعداد ہے۔ سرکاری تعلیمی نظام میں گنجائش اور معیار کی کمی کے باعث بھی اداروں نے تعلیم کے میدان میں اہم خلا کو پُر کیا ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق، پاکستان میں تقریباً 39 فیصد طلبہ نجی تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ پنجاب میں یہ تناسب 45 فیصد سے بھی تجاوز کر چکا ہے۔ اور ملک کے بڑے شہروں میں یہ شرح 55 فیصد سے زائد ہے۔ ملک میں رجسٹرڈ نجی اسکولوں کی تعداد 1 لاکھ 80 ہزار سے زیادہ ہے۔

نجی تعلیمی اداروں کا سب سے بڑا مثبت پہلو معیارِ تعلیم میں بہتری ہے۔ ان کا جدید اور انگلش میڈیم طرز تعلیم ہے۔ قومی زبان کی اہمیت اپنی جگہ مگر یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ دنیا میں اور پاکستان میں بھی اعلی سرکاری و نجی داروں میں انگریزی زبان ہی کا سکہ رائج الوقت ہے۔ جبکہ "اے آئی" اور "آئی ٹی" نے تو انگریزی زبان کو مزید ناگزیر بنا دیا ہے۔ اسی تناظر میں خاص طور پر بڑے شہروں میں واقع نجی اسکول، کالجز اور یونیورسٹیاں جدید نصاب، تربیت یافتہ اساتذہ اور بہتر تعلیمی ماحول فراہم کرتی ہیں۔ پاکستان سوشل اینڈ لیونگ اسٹینڈرڈ سروے (PSLM) کے مطابق نجی اسکولوں کے طلبہ کی تعلیمی کارکردگی عمومی طور پر سرکاری اسکولوں کے طلبہ سے بہتر ہوتی ہے۔ گزشتہ سال میٹرک کے امتحانات میں 85 فیصد پوزیشنز نجی تعلیمی اداروں کے طلبا و طالبات نے حاصل کیں اور یہ شرح کالجز اور مقابلے کے امتحانات میں نجی اداروں کے حوالے سے مزید بہتر ہے۔ زبان، اعتماد سازی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے نجی اداروں کا کردار less match ہے۔

تاہم نجی تعلیمی اداروں کے کردار پر تنقید بھی کی جاتی ہے، جن میں سب سے بڑی شکایت فیسوں کی زیادہ شرح ہے۔ یا گلی محلے میں غیر معیاری عمارتوں میں قائم ہونے والے چھوٹے چھوٹے سکول ہیں۔ جہاں ریاضی یا کسی بھی مضمون کا استاد ہی سکول یا کالج کا سربراہ بھی ہے۔ اور چھوٹا بھائی یا بیوی ڈائریکٹر ہے۔ اور سکول یا کالج بنیادی سہولیات سے عاری ہیں۔

حکومت کی جانب سے بھی تعلیمی اداروں پر کنٹرول کے لیے قوانین موجود ہیں، انہیں مزید بہتر کرنا چاہیے۔ پرائیویٹ ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز ریگولیٹری اتھارٹی (PEIRA) اور صوبائی ریگولیٹری باڈیز جیسے PCTB اور SEF کے باوجود کئی اسکول رجسٹریشن اور معیار کو برقرار رکھے بغیر کام کر رہے ہیں۔ نجی تعلیمی ادارے پاکستان کے تعلیمی نظام کا لازمی حصہ بن چکے ہیں، اور ان کا پاکستان کی ترقی اور تعمیر میں ناقابل فراموش کردار ہے۔

☆☆☆

ہم زاد

کوئی تو ہو جو میری تیرہ شبوں کا ساتھی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ انیتا الوریز(Anita Alvarez)۔۔۔جوایک معروف میکسیکن سوئمر تھی۔

2022 کے بُڈا پیسٹ ورلڈ سوئمنگ چیمپین شپ میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جس میں ایک فن پانی کے نیچے زیادہ سے زیادہ دیر تک رہنا تھا۔۔۔

جب کافی دیر تک وہ سطحِ آب پر نہیں آئی ۔۔۔تو جج سمیت سب تالیاں بجا رہے تھے۔۔۔سب کے خیال میں اس نے ورلڈ ریکارڈ قائم کر دیا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انیتا ڈوب گئی ہے۔۔۔

سوائے اُس کی کوچ کے۔۔۔

اس کو محسوس ہوا کہ معاملہ صحیح نہیں ہے۔۔۔۔کیونکہ وہ جانتی تھی کہ انیتا کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ کتنی دیر پانی کے نیچے رہ سکتی ہے۔۔۔

یہ وقت غیر معمولی تھا۔

اس نے فوراایک صحیح فیصلہ کیااور پانی میں چھلانگ لگادی اور اسے پانی کے نیچے سے نکالا۔

وہ بے ہوش تھی اور اس کے پھیپھڑوں میں پانی گھس چکا تھا۔۔۔

انیتا بچ گئی۔۔۔

پتہ ہے کیوں؟

کیونکہ اس کے پاس ایک شخص ایسا تھاجو اسے جانتا تھا۔۔۔

جواس کی صلاحیتوں خامیوں سمیت اسے جانتا تھا۔۔۔

اگر آپ کے پاس بھی کوئی ایسادوست گرویامرشد ہے جو آپ کو جانتا ہے۔

آپ کی خامیاں اور خوبیاں جانتا ہے۔
آپ کے درد کو برداشت کرنے کی صلاحیت اور دباؤ کو مینج کرنے کی آخری حد کو جانتا ہے۔
وہ آپ میں آنے والی تبدیلیوں کو نوٹس کر سکتا ہے۔۔۔۔
یاد رکھیے گا ایک ایسا دوست۔۔۔ آپ کے ہزار ملنے جلنے والے اور عزیز واقارب سے بہتر ہے۔
یہ واحد شخص ہو گا جو آپ کو ٹوٹنے سے بچا سکتا ہے۔۔۔
جو آپ کو اپنے اندر غرق ہونے اور دفن ہونے سے نکال سکتا ہے۔۔۔
ایک ایسا دوست اگر آپ کے پاس ہے تو آپ دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ایک ہیں۔۔۔
یاد رکھیے گا۔۔۔۔۔ عموماً یہ شخص باپ ہوتا ہے۔۔۔
یا خدا کی بخشی ایک اچھی شریکِ حیات۔
یا ایک۔ دوست۔۔۔
خدا پاک آپ کے ایسے دوستوں کو سلامت رکھے۔ آمین

☆☆☆

باپ۔۔۔

تم اور میں کبھی بیوی اور شوہر تھے؛ پھر تم ماں بن گئیں اور میں باپ بن کے رہ گیا۔

تم نے گھر کا نظام سنبھالا اور میں نے ذریعہ معاش کا اور پھر تم "گھر سنبھالنے والی ماں" بن گئیں اور میں "کمانے والا باپ" بن کر رہ گیا۔۔۔

بچوں کو چوٹ لگی تو تم نے گلے لگایا اور میں نے سمجھایا، تم محبت کرنے والی ماں بن گئیں اور میں صرف سمجھانے والا باپ ہی رہ گیا۔۔

بچوں نے غلطیاں کیں تم ان کی حمایت کر کے "understanding mom" بن گئیں اور میں "نہ سمجھنے والا" باپ بن کے رہ گیا۔۔

"بابا ناراض ہوں گے" یہ کہہ کر تم اپنے بچوں کی "best friend" بن گئیں۔۔۔ اور میں "غصہ کرنے والا باپ" بن کے رہ گیا۔۔

تم سارا دن بچوں سے راز و نیاز کرتے ہوئے اپنا مستقبل محفوظ بناتے ہوئے بچوں کے ذہنوں میں گھر کرتی چلی گئیں۔۔۔

اور میں فقط گھر کا مستقبل بنانے کے لیے اپنا آج برباد کرتا چلا گیا۔

تمہارے آنسوؤں میں ماں کا پیار نظر آنے لگا اور میں بچوں کی آنکھوں میں فقط "بے رحم باپ" بن کے رہ گیا۔۔۔

تم چاند کی چاندنی بنتی چلی گئیں اور پتہ نہیں کب میں "سورج کی طرح آگ اُگلتا باپ" بن کر رہ گیا۔۔

تم ایک "رحم دل اور شفیق ماں" بنتی گئیں اور میں تم سب لوگوں کی زندگی کا بوجھ اٹھانے والا "صرف ایک باپ" بن کر رہ گیا۔

یہ ایک انتہائی تلخ معاشرتی تصویر ہے۔

بہت کم ایسی مائیں ملیں گی جو اپنے بچوں کے سامنے اُنکے باپ کا مقام بلند کرکے رکھتی ہیں جو بچوں کو یہ بتاتی ہیں کہ کیسے اُن کا باپ اپنے آگے کا نوالہ اپنے بچوں کو کھلا کر خود بھوکا رہ جاتا ہے۔ کیسے ایک باپ سارا دن اپنے بچوں کے رزق کیلئے مارا مارا پھرتا ہے۔ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کیلئے کیا کیا قربانیاں دیتا ہے اور کن کن تکالیف کا سامنا کرتا ہے۔ کس طرح اُن کو اُن کے پیروں پر کھڑا کرنے کیلئے اپنے آپ کو برباد کرلیتا ہے خود کو ختم کرلیتا ہے۔ تب کہیں جا کر اولاد کسی قابل بنتی ہے۔

مگر اولاد کو یہ بتانے اور سمجھانے والی مائیں اُن کو یہ نہیں بتا پاتیں۔

اسی لیے اولاد اُس وقت تک اس بات کو سمجھ ہی نہیں پاتی جب تک وہ خود باپ نہ بن جائے اور تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

☆☆☆

چلی ہے رسم کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

یہ رسم پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف (تب آرمی چیف کو کمانڈر انچیف کہا جاتا تھا) کے قائداعظم کو 1948 میں انکار سے شروع ہوئی تھی۔ ہنوز طمطراق سے جاری ہے۔

اگر کوئی مائی جندو "سر" اٹھا ہی لے تو انصاف لینے اور منصف کے فیصلے پر عمل کروانے کے لیے بھی جانیں دینی پڑتی ہیں۔

سندھ کی مائی "جندو" مر گئیں ہیں۔

عجب آزاد "مرد" تھی۔

5 جون 1992ء ٹنڈو بہاول سندھ کے گاؤں میں حاضر سروس میجر ارشد جمیل نے پاک فوج کے دستے کے ساتھ چھاپہ مار کر 9 کسانوں کو گاڑیوں میں بٹھایا اور جامشورو کے نزدیک دریائے سندھ کے کنارے لے جا کر قتل کر دیا، فوج نے الزام لگایا کہ یہ افراد دہشت گرد تھے۔ اور ان کا تعلق بھارت کے ادارے ''ریسرچ اینڈ اینالائسس ونگ" سے تھا۔ لاشیں گاؤں آئیں تو نہ صرف گاؤں بلکہ پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔۔ ہر ماں اپنے بیٹے کی لاش پر ماتم کر رہی تھی ان کے بین دل دہلا رہے تھے۔۔۔ خاموشی سے میتیں دفنانے کا مشورہ دیا گیا کہ "قاتل" طاقتور ہیں، کسانوں کا ان سے کیا مقابلہ،

اسی گاؤں کی مائی جندو کے تین بیٹے اندھی طاقت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

مائی جندو کو رونے کے لیے کہا گیا تو اس نے وحشت ناک نگاہوں سے میتیوں کی طرف دیکھا اور بولی:

"بس! مائی جندو ایک ہی بار روئے گی، جب بیٹوں کے قاتل کو پھانسی کے پھندے میں لٹکتا دیکھے گی۔"

سب جانتے تھے ایسا ممکن نہیں تھا مگر جنازے اٹھے تو مائی جندو نے سر کی چادر کمر سے باندھی سیدھی کھڑی ہوئی بیٹوں کو الوداع کیا، مسئلہ یہ تھا کہ یہ ٹنڈو بہاولپور (سندھ) دریائے سندھ کے کنارے پر قتل ہونے والوں کی وڈیو بنانے کے لیے موبائل کیمرہ بھی نہیں آیا تھا۔

پرچہ نکلا کہ دشمن کے ایجنٹ مار کر ملک کو بڑے نقصان سے بچا لیا گیا۔ جس نے پڑھا سُنا اس نے شکر کیا۔ (بچاری معصوم و مظلوم عوام)

جب سارا ملک شکرانہ ادا کر رہا تھا، تب مائی جندو نے احتجاجی چیخ ماری۔ اس چیخ نے پرنٹ میڈیا کی سماعتیں چیر کے رکھ دیں۔

مائی جندو بوڑھی تھی جسمانی لحاظ سے کمزور مگر وہ 3 مقتولوں کی ماں تھی اس نے اپنی دو بیٹیوں کو ساتھ لے کر قاتلوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، سوشل میڈیا کی غیر موجودگی میں یہ جنگ آسان نہ تھی مگر نقارے بج چکے تھے کشتیاں جل چکی تھیں اور واپسی محال تھی۔ اخباروں اور صحافیوں کے ہمراہ مائی جندو نے اس چیخ کو طاقتی مراکز کے سینوں میں گھونپ دیا، پہلی جھڑپ ختم ہوئی اور گرد چھٹی تو معلوم ہوا کہ قتل ہونے والے دہشت گرد نہ تھے بلکہ (حاضر سروس) میجر ارشد جمیل کا ان کے ساتھ زرعی زمین کا جھگڑا تھا، جس کی سزا میں انہیں قتل ہونا پڑا تھا۔

24 جولائی 1992ء کو جنرل آصف نواز نے اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف سے ملاقات کی جس میں یہ معاملہ زیرِ غور آیا اور جنرل آصف نواز نے میجر ارشد جمیل کا کورٹ مارشل کرنے کا حکم دے دیا۔

29 اکتوبر کو فیلڈ جنرل کورٹ مارشل نے میجر ارشد جمیل کو سزائے موت اور 13 فوجی اہلکاروں کو عمر قید کی سزا سنائی۔

سپہ سالار نے رحم کی اپیل 14 ستمبر 1993 کو مسترد کی، اس کے بعد رحم کی اپیل صدر فاروق لغاری سے کی گئی جو 31 جولائی 1995 کو مسترد ہوئی لیکن سزا پر عمل درآمد روک دیا گیا۔

میجر کے بھائی کی اپیل پر سپریم کورٹ کے جج سعید الزمان صدیقی نے حکم امتناع جاری کیا اور سزا روک دی۔ سزائے موت پر عمل نہ ہونے پر 11 ستمبر 1996، مائی جندو پھر میدان میں نکلی۔

اس کی 2 بیٹیوں نے حیدرآباد پریس کلب کے سامنے تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا کر جان دے دی۔ ملک میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا، بالآخر 28 اکتوبر 1996 کو طاقت کی دیواریں مائی جندو کے مسلسل دھکوں کے سامنے ڈھیر ہو گئیں۔

حیدر آباد سنٹرل جیل میں مائی جندو کو لایا گیا، سامنے تختہ دار پر اس کے گاؤں کے 9 بیٹوں کا قاتل میجر ارشد کھڑا تھا۔ تختہ دار کھینچا گیا۔ قاتل میجر ارشد جمیل کا جسم جھول گیا۔

سامنے کھڑی مائی جندو کی بوڑھی مگر زور آور آنکھ سے ایک اشک نکلا، اس کے رخسار کی جھریوں میں تحلیل ہو گیا۔۔مائی جندو تمہیں دنیا کے تمام کمزور اور مظلوم سلام کرتے ہیں۔

☆☆☆

کیا صرف نصابی تعلیم کافی ہے؟

تعلیم، اگر صرف کتابوں کی ورق گردانی نہ ہو بلکہ دل کے دریچوں میں اترتی ہوئی روشنی بن جائے، تو انسان کے اندر ایک خاموش انقلاب برپا کرتی ہے۔

روحانی سطح پر یہ شعور کو جِلا دیتی ہے۔ انسان اپنے وجود، اپنے ربّ اور اپنی مقصدیت کو نئے سرے سے پہچاننے لگتا ہے۔ علم جب عبادت بن جائے تو دل تکبر سے نہیں، شکر سے بھرتا ہے۔ اور یہی شکر انسان کو وہ وقار دیتا ہے جسے دنیا کی کوئی ڈگری نہیں دے سکتی۔

معاشرتی میدان میں تعلیم انسان کو بھیڑ کا حصہ نہیں بلکہ روشنی کا منبع بنا دیتی ہے۔ تعلیم یافتہ فرد، چاہے وہ کسی چھوٹی ورکشاپ میں بیٹھا ہو یا کسی بڑے ادارے میں فیصلے کر رہا ہو، سماج میں ادب، برداشت، انصاف اور بہتر رویوں کی بنیاد رکھتا ہے۔ معاشرہ دراصل انسان کے رویوں سے بنتا ہے، اور رویوں کی تہذیب صرف تعلیم کی دھڑکن سے چلتی ہے۔ یہ وہ چشمہ ہے جس سے مہذب معاشرت پھوٹتی ہے۔ گفتگو میں نرمی، اختلاف میں تحمل، اور عمل میں دیانت۔

اختراع کی دنیا میں تعلیم وہ چنگاری ہے جو انسانی ذہن کو مروجہ راستوں سے آگے لے جاتی ہے۔ جب علم صرف یادداشت کا بوجھ نہ رہے بلکہ سوال کی لگن بن جائے، تب انسان وہ چیزیں ایجاد کرتا ہے جنہیں کل تک ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ یہی تعلیم ذہن کو قفل نہیں، کنجی بن کر ملتی ہے۔ نئی صنعتیں، نئے خیالات اور نئی دنیا اسی کنجی سے جنم لیتی ہیں۔ اختراع تب ہوتی ہے جب تعلیم انسان میں جستجو، بے خوفی اور کچھ نیا کرنے کا حوصلہ پیدا کرے۔

یوں تعلیم صرف کلاس روم کی دیواروں میں بند کوئی رسمی مشق نہیں۔ یہ روح کی پاکیزگی، معاشرے کی تعمیر اور ذہن کی پرواز کا مکمل سفر ہے۔ اور جو قومیں اس سفر کو پہچان لیں، وہی مستقبل کے راستے خود تراشتی ہیں۔

جبکہ ساری عمر ہمیں یہ افسانہ سنایا جاتا ہے کہ ڈگریاں کامیابی کی کنجی ہیں۔ والدین کی محبت بھری نصیحتیں، اساتذہ کے خطیبانہ لیکچر، اور معاشرے کی اجتماعی گواہی! سب یہی ایک نعرہ دہراتے رہے کہ "پڑھو گے تو بنو گے صاحب"۔ مگر حقیقت کی دھوپ جب چہرے پر پڑتی ہے تو یہ نعرہ دھندلا سا ہو جاتا ہے۔

وہ بیٹا جو بچپن سے خوابوں کی کھاد پر پلتا رہا، بی اے، ایم اے، ایم فل، یہاں تک کہ پی ایچ ڈی تک جا پہنچا۔ جب وہ عملی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈگریاں تو شاید صرف فریم میں اچھی لگتی ہیں، تنخواہ میں نہیں۔

تعلیم کا المیہ یہ ہے کہ اس کا ایک چہرہ غریب کے لیے ہے اور دوسرا امیر کے لیے۔ غریب کا بچہ سرکاری اسکول سے لے کر سرکاری یونیورسٹی تک وہی پڑھتا ہے جسے زمانہ کب کا پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ اور امیر کا بیٹا؟ وہ جدید لیبارٹریوں، بہترین اساتذہ اور عالمی اداروں کے دروازوں سے گزرتا ہوا اپنے لیے وہ آسمان چن لیتا ہے جہاں پہنچ کر فیصلہ سازی اس کا کام اور کام کر کے دکھانا کسی غریب باپ کے بیٹے کی مجبوری بن جاتا ہے۔

دنیا کا دستور بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

عالی شان ڈگری ہو، زبان پر روانی ہو، اور ساتھ مضبوط سفارش، تو منزل قریب ہے۔ ورنہ قسمت کے کسی بھولے بھٹکے دن ہی کوئی در کھلتا ہے اور اگر وہ در نہ کھلے تو بیس پچیس سال کی محنت کے بعد کہیں جا کر وہ آمدن شروع ہوتی ہے جو خوابوں کو نہیں، بس ضرورتوں کو زندہ رکھنے کے قابل ہو۔

المیہ صرف یہ نہیں کہ ڈگری نوکری نہیں دلاتی، اصل المیہ یہ ہے کہ وہ عمر، وہ اعتماد، وہ وقت جو ہمیشہ لوٹ کر نہیں آتا۔ وہ سب تعلیمی ڈگریوں کے بدلے میں خاموشی سے قربان ہو جاتا ہے۔

کامیاب لوگوں کی مثالیں بہت دی جاتی ہیں: چند افسر، چند اینکر، کچھ بینکر، کچھ پروفیسر مگر بائیس کروڑ کی بھیڑ میں یہ چند ہزار مثالیں وہ حقیقت نہیں بدل سکتیں کہ عام ڈگری یافتہ نوجوان عموماً ہزاروں کی قطار میں ایک بن کر رہ جاتا ہے۔

تو پھر مسئلے سے کیسے نمٹا جائے؟

اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ بچوں کو یہ حقیقت بچپن سے سمجھا دی جائے کہ صرف پڑھائی کسی کی تقدیر نہیں لکھتی۔ اصل تقدیر ہنر لکھتا ہے، مسلسل سیکھنا لکھتا ہے، اور ہاتھ میں وہ فن

لکھتا ہے جو حالات کی تھپیڑوں میں انسان کو سہارا دیتا ہے۔ چاہے دکان پر بیٹھنا ہو، چاہے ورکشاپ پر مفت بیٹھ کر کام سیکھنا ہو، چاہے سبزی کی ریڑھی کی گتھیاں سمجھنی ہوں یا موبائل ٹھیک کرنا۔ کچھ نہ کچھ ایسا سیکھنا ضروری ہے جو بوقتِ ضرورت روٹی کما کر دے سکے۔

اسی طرح بیٹیاں بھی مہنگے خوابوں کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ایسا ہنر سیکھیں جو ضرورت پڑنے پر ان کے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ چاہے درزی کا فن ہو، آن لائن کاروبار، میک اپ آرٹسٹری، پراپرٹی ڈیلنگ، یا گھر کے کھانوں کو روزگار بنانا۔

کیونکہ سچ یہی ہے:

عام ڈگری والا بچہ چاہے کتنے ہی تمغے کیوں نہ لے آئے۔ آج کے مقابلے کے دور میں بھیڑ کا حصہ رہ جاتا ہے، فاتح نہیں۔

المیہ یہاں ختم نہیں ہوتا! سب سے بڑا ظلم تو وہ ہے جب اولاد اپنے باپ کے کاروبار کو حقیر سمجھ کر منہ موڑ لیتی ہے۔ باپ کی ورکشاپ، مچھلی منڈی، سکریپ یارڈ، نرسری، قصائی کی دکان، یا کوئی بھی چھوٹا کاروبار — جس نے گھر چلایا، اولاد پالی، خواب سجائے وہ سب کچھ اولاد کے لیے "کم تر" ہو جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسی کاروبار نے نسلوں کو پروان چڑھایا ہے، اور آج بھی وہی کاروبار اتنی کمائی دے دیتے ہیں جتنی بیس ہزار کی نوکریاں لینے والا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔

بچے کو پڑھائیں ضرور،
لیکن اس کا ہاتھ مت باندھیں
خواب دکھائیں ضرور،

مگر اسے یہ بھی سکھائیں کہ خواب صرف تب سچ ہوتے ہیں جب ہاتھ میں ہنر ہو۔ تحریریں، نصاب، شاعریاں، قواعد، سب اپنی جگہ، مگر زندگی کا راز ڈگری سے زیادہ ایک ہنر جاننے میں پوشیدہ ہے۔ پڑھائی انسان کو مہذب بنا سکتی ہے، مگر باعزت روزگار ہمیشہ کسی نہ کسی سیکھے ہوئے فن سے پیدا ہوتا ہے۔

بس اتنا یاد رہے:

عزت، اطمینان اور آسودگی کا راستہ ڈگریوں سے نہیں، ہنر سے نکلتا ہے اور زندگی کی کمائی ہمیشہ چند روپے جمع کرنے سے شروع ہوتی ہے۔۔۔

☆☆☆

انسانی حرمت اور مولانا طارق جمیل

آج کل یہ تصویر بہت وائرل ہو رہی ہے جس میں مولانا کے طرزِ زندگی پر تنقید کی جا رہی ہے۔ جذبات اور مخالفت سے قطع نظر ہو کر فیصلہ کرنا ہم سب پر فرض ہے۔ درست فیصلے کے لیے صرف تین سوالوں کے جواب تلاش کرنے چاہئیں۔

۱۔ کیا یہ گاڑی مولانا کی اپنی ہے یا کسی نے پک اپ اور ڈراپ کے لیے بھیجی ہے؟
۲۔ کیا کسی دوسرے شخص کی عالی شان گاڑی میں ضرورتاً بیٹھنا دین و اخلاق کی رو سے حرام ہے؟
۳۔ اگر اپنی اور حلال کی ہے مگر تکبر اور نمود و نمائش کے لیے نہیں تو کیا حرج ہے؟

اگر ان تینوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر کسی قسم کی کردار کُشی اور تنقید کی گنجائش نہیں بنتی خواہ مولانا کے طرزِ استدلال، مکتبہ فکر، تبلیغ اور خیالات سے ہمیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ یہی دین کا تقاضا ہے اور یہی اخلاقیات کا وہ امتحان ہے جس میں ہم ہر لمحے اپنی پوسٹ، لائکس اور کمنٹ کی آزمائش میں گرفتار ہیں۔

نوٹ: مجھے خود مولانا کے طرزِ استدلال پر کئی اعتراضات ہیں لیکن اس کے باوجود اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ ان کی عزت و حرمت پر اچھالی جانے والی کیچڑ کی ویسے ہی نشاندہی کی جائے جیسی ہم اپنی ذات کے لیے کرتے ہیں۔

22 دسمبر 2017

☆☆☆

فلسفہ ء کربلا

کسی نے اِسے محض بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی چپقلش بتایا اور بنو اُمیہ و دیگر کو سینگوں پر لے لیا۔ کسی نے اسے خروج کہہ ڈالا اور لگا ہمیں "اصولِ" دنیاداری سمجھانے۔

جناب اس ضمن میں دو باتیں یاد رکھ لیجیے۔

قربان ہونے والا اس روایت کا امین تھا جو واضح طور اعلان کرتی ہے کہ "اِس فاطمہ کی جگہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی ہوتی تو اس کے ہاتھ بھی کاٹے جاتے"۔ یعنی یزید کی جگہ کسی بھی قبیلہ، یہاں تک کہ بنو ہاشم کا بھی کوئی فرد ہوتا لیکن اخلاق و کردار یزید والا رکھتا تو امام حسین علیہ السلام اس کی بھی ایسے ہی گرفت کرتے جیسا کہ یزید کے لیے ارادہ فرمایا۔

دوسرا یہ کہ امام حسین علیہ السلام کی کربلا سے پہلے کی زندگی بھی ہمارے سامنے ہے۔ کیا معمولات تھے ان کے؟ سیاسی جوڑ توڑ کبھی ان کی مجالس کا محور رہا؟ کیا دین کی تبلیغ، اور اس کی درس و تدریس کے علاوہ بھی ان کے کوئی دیگر مشاغل رہے؟

کربلا کا واقعہ ہو جاتا ہے، اب جبکہ عوامی ہمدردی بھی حاصل ہے تو کتنے لشکر ترتیب دیے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے؟ کیا انہوں نے وہی کام جاری نہیں رکھا جو امام حسین علیہ السلام کا تھا، دین کی تبلیغ اور حکمت کا بیان؟

دوسری طرف یہ دیکھ لیجیے کہ یزید کے معمولات مسند اقتدار پر بیٹھنے سے پہلے کیا تھے۔ تخت نشینی کے بعد ان میں کچھ بھی بہتری آئی؟ یا للے تللے اور بڑھ گئے؟ وہ دوست جو کہتے ہیں کہ یزید کربلا کے واقعہ سے آزردہ ہوا، کیا بتا سکتے ہیں کہ کربلا کے بعد اس کے کردار یا طرزِ حکومت میں کیا تبدیلی آئی؟ کیا اس نے عملی ندامت کا اظہار کیا یا حرمین پر فوج کشی کر دی؟

تاریخ، کسی ایک دن، یا اس دن واقع ہونے والے کسی واقعہ کا نام نہیں، تاریخ ایک سیاق وسباق کا نام ہے۔ اس ایک دن پر سب فیصلے مت کیجیے، یہ دیکھیے کہ تناظر کیا ہے۔ ماقبل اور مابعد کیا حالات تھے، آیا اس واقعہ نے کسی کا طرزِ عمل بدل دیا یا اس کی مضبوطی اور کمزوری، بالترتیب، اور بھی واضح کر دی۔

تاریخ کا کمال یہ ہے کہ ایک دن یا واقعہ کی اساس معلوم کرنے کے لیے سالوں کا سفر آگے اور پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ پھر بات واضح ہوتی ہے۔ اس سے کم پر فیصلہ ہمیشہ اپنے اندر تضادات لیے ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا دلائل سے تین باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

1. بنو اُمیہ کی جگہ کوئی بھی ہوتا، امام عالی مقام علیہ السلام کا اقدام یہی ہوتا۔ اس کی بنیاد نہ قبائلی عصبیت تھی اور نہ اقتدار کی طلب۔
2. اس واقعہ نے عزیمت اور حرص کو ممیز کر دیا۔ عمومی سطح پر ''حُر'' اور ''ابنِ زیاد'' اس کے دو استعارے بن گئے۔
3. حق اور باطل اس جنگ سے پہلے بھی واضح تھا، اس جنگ اور اس کے بعد کے واقعات نے اس کو پتھر پر لکیر کر دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ہماری ذاتی پسند و ناپسند ہے، ہماری انا ہے، ہمارا مسلک ہے یا پھر تعصب۔ اسے ہم نے فرقہ بازی کا میدان بنا لیا یا سیاست کا۔ اس کی جوابدہی ہمیں الگ سے کرنا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف سچی گواہی کی وقعت ہے۔ باقی سب، محض کُوڑ کباڑ۔

10 اکتوبر 2016

☆☆☆

آسانیاں تقسیم کیجئے

واٹس ایپ پہلے ہی دنیا بھر کے لوگوں کو مفت بات چیت کا موقع دے چکا ہے۔ اس کے موجد "جین کوم" (Jan Koum) کو خود اپنے والد سے دوری اور فون پر بھی بات نہ کرپانے کا جو دکھ تھا، اس کے احساس کی وجہ سے اس نے دوسروں کو قریب لانے والی یہ ایجاد کی۔

جین کوم یوکرائن کے ایک غریب یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ گھر میں بجلی تھی نہ گیس۔ یہ لوگ سردیوں میں بھیڑوں کے ساتھ سونے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ 1992ء میں یہودیوں پر حملے بھی شروع ہو گئے تو والدہ نے نقل مکانی کا فیصلہ کیا لیکن والد نے وطن چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

ماں نے بیٹے کا ہاتھ تھاما اور یہ دونوں امریکا آ گئے۔ کیلیفورنیا میں ان کے پاس مکان تھا نہ کچھ کھانے کو۔ امریکا میں حکومت انتہائی غریب لوگوں کو کھانے پینے کی اشیاء خریدنے کیلئے فوڈ سٹیمپس دیتی ہے۔ یہ سٹیمپس خیرات ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اتنے غریب تھے کہ زندگی بچانے کے لیے خیرات لینے پر مجبور تھے۔

جین کوم پڑھنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی مہنگی ہونے لگی۔ فوڈ سٹیمپس سے گزارہ مشکل ہو گیا۔ جین کوم نے پارٹ ٹائم نوکری تلاش کی تو ایک گروسری اسٹور میں خاکروب کی ملازمت ملی۔ وہ برسوں یہ کام کرتا رہا۔ اتنی غربت میں والد سے فون پر بات بہت مشکل خواہش تھی۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں کمپیوٹر پروگرامنگ کے خبط میں مبتلا ہو گیا۔ یہ شوق اسے سین جوز اسٹیٹ یونیورسٹی (San Jose State University) لے گیا۔ 1997ء میں وہ "یاہو" میں بھرتی ہوا۔

2004ء میں ''فیس بک'' آئی اور 2007ء میں دنیا کی بڑی کمپنی بن گئی۔ جین کوم نے فیس بک میں اپلائی کیا لیکن فیس بک کو اس میں کوئی پوٹینشل نظر نہ آیا۔ اور اسے نوکری نہ دی۔ وہ مزید دو سال ''یاہو'' میں رہا۔ اس دوران اس نے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے آئی فون خرید لیا۔ اس آئی فون نے اس کے مستقبل کی تشکیل کی۔

جین کوم نے فون استعمال کرتے کرتے ایک دن سوچا کہ میں کوئی ایسی اپلی کیشن کیوں نہ بناؤں جو فون کا متبادل بھی ہو، ایس ایم ایس بھی کیا جا سکے، تصاویر اور ڈاکومنٹس بھی بھجوائی جا سکیں اور جسے ''ہیک'' بھی نہ کیا جا سکے۔ یہ آئیڈیا اپنے ایک دوست برائن ایکٹون(Brian Acton) کے ساتھ شیئر کیا۔ یہ دونوں اسی آئیڈیا پر کام میں جُت گئے۔ یہاں تک کہ دو سال میں ایک طلسماتی اپلی کیشن بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ''ایپ'' فروری 2009ء میں لانچ ہوئی اور اس نے پوری دنیا کو جوڑ دیا۔

یہ اپلی کیشن ''واٹس ایپ'' کہلاتی ہے۔ دنیا کے ایک ارب لوگ اس وقت یہ ایپ استعمال کر رہے ہیں۔ آپ واٹس ایپ ڈاؤن لوڈ کریں اور دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں آپ کو نیا فون اور نیا نمبر خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور آپ پوری دنیا کے ساتھ رابطے میں رہیں گے۔

جین کوم کو واٹس ایپ نے چند ماہ میں ارب پتی بنا دیا۔ یہ اپلی کیشن اس قدر کامیاب ہوئی کہ فروری 2014ء میں فیس بک بھی ''واٹس ایپ'' کی خریداری کی دوڑ میں شامل ہو گئی۔ فیس بک کی انتظامیہ نے جب اس سے رابطہ کیا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور قہقہہ لگا کر کہا ''یہ وہ ادارہ تھا جس نے مجھے 2007ء میں نوکری دینے سے انکار کر دیا تھا'' ہنستے ہنستے اس نے ''فیس بک'' کو ہاں کر دی۔ 19 ارب ڈالر میں سودا ہو گیا۔ یہ کتنی بڑی رقم ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ پاکستان کا کل زرمبادلہ 20 ارب ڈالر کے آس پاس رہتا ہے۔

جین کوم نے فیس بک کے ساتھ سودے میں صرف ایک شرط رکھی کہ میں فوڈ سٹیمپس دینے والے ادارے کے ویٹنگ روم میں بیٹھ کر معاہدے پر دستخط کروں گا۔ فیس بک کے لیے یہ شرط عجیب تھی۔ یہ لوگ معاہدہ اپنے دفتر یا اس کے آفس میں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن فیس بک کو اس کی ضد ماننا پڑی۔ تاریخ طے ہوئی، فیس بک والے فلاحی سینٹر پہنچے۔

وہ ویٹنگ روم کے آخری کونے کی آخری کرسی پر بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔ وہ کیوں نہ روتا، یہ وہ سینٹر تھا جس کے اس کونے کی اس آخری کرسی پر بیٹھ کر وہ اور اس کی ماں گھنٹوں "فوڈ سٹیمپس" کا انتظار کرتے تھے۔

یہ دونوں کئی بار بھوکے پیٹ یہاں آئے اور شام تک بھوکے پیاسے یہاں بیٹھے رہے۔ ویٹنگ روم میں بیٹھنا اذیت ناک تھا لیکن اس سے بڑی اذیت کھڑکی میں بیٹھی خاتون تھی۔ وہ خاتون ہر بار نفرت سے ان کی طرف دیکھتی تھی، طنزیہ مسکراتی تھی اور پوچھتی تھی "تم لوگ کب تک خیرات لیتے رہو گے، تم کام کیوں نہیں کرتے؟" یہ بات سیدھی ان کے دل میں "تیر ترازو" ہو جاتی تھی لیکن یہ لوگ خاموش کھڑے رہتے تھے۔

خاتون انہیں "سلپ" دیتی تھی، ماں کاغذ پر دستخط کرتی تھی اور یہ لوگ آنکھیں پونچھتے ہوئے واپس چلے جاتے تھے۔ وہ برسوں اس عمل سے گزرتا رہا، چنانچہ جب کامیابی ملی تو اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی اسی ویٹنگ روم میں منانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے 19 ارب ڈالر کی ڈیل پر "فوڈ سٹیمپس" کے انتظار میں بیٹھے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر دستخط کئے۔ چیک لیا اور سیدھا کاؤنٹر پر چلا گیا۔ فوڈ سٹیمپس دینے والی خاتون آج بھی وہاں موجود تھی۔ جین نے 19 ارب ڈالر کا چیک اس کے سامنے لہرایا اور ہنس کر کہا

"آئی گاٹ اے جاب"

اور سینٹر سے باہر نکل گیا۔

ایک سبق یہ بھی ہے کہ لوگوں کیلئے آسانیاں پیدا کرنے والے کو ضرور صلہ ملتا ہے۔

8 دسمبر 2018

☆☆☆

پردہ گرتا ہے

(قتل و غارت، جنگوں کے علاوہ سب سے زیادہ نا انصافیاں اور بے جااموات پاکستان کی عدالتوں میں ہوئی ہیں۔ اس تناظر میں لکھا گیا کالم)

پردہ اٹھتا ہے

پہلا منظر۔۔۔۔۔۔

☆ تم کون ہو؟

میرا نام حسین نقی ہے۔

☆ تم کیا شے ہو جس کی وجہ سے ایک سابق جج کو صحت کی کمیٹی سے استعفیٰ دینا پڑا؟

میں آپ سے 20 برس بڑا ہوں، صحافی ہوں اور صحت کمیٹی کا ممبر ہوں۔

☆ تم بد تمیز آدمی ہو۔ میں ابھی تمہارے خلاف توہینِ عدالت کا نوٹس جاری کروں گا۔

آپ میری مکمل بات سُن لیجیے۔

☆ اُونچا مت بولو، ابھی معافی مانگو۔

میں معافی مانگ لیتا ہوں حضور۔

☆ اس بد تمیز آدمی کو میری عدالت سے باہر لے جاؤ۔

اور 80 سالہ "بد تمیز" عدالت سے باہر بھیج دیا گیا۔

دوسرا منظر

☆ آپ کون ہیں؟

---۔ میں لبیک تحریک کا سربراہ ہوں اور دنیا مجھے حضرت مولانا خادم حسین رضوی کے نام سے بلاتی ہے۔

اور میں پیر فضل گجراتی

☆ مولانا صاحب اور پیر صاحب! سب سے پہلے تو آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو آنے کی زحمت اٹھانا پڑی۔ جانتا ہوں "وہیل چیئر" کے ساتھ عدالت میں آپکا تشریف لانا کتنا مشکل ہے۔ اور پیر صاحب آپکا اس عمر میں گجرات سے یہاں آنا بھی آسان نہیں۔

آپ کے مخالفین آپ کے خلاف شکایت لے کر آئے ہیں کہ آپ نے اعلیٰ عدالت کو گالی دی ہے، کیا سچ ہے؟

---۔ کس "دَلّے" نے یہ کہا ہے کہ میں نے عدالت کو گالی دی ہے؟ میں نے ان ججوں کی "پین دی سری" کی ہے جو "دلّے" اور "بے غیرت" ہیں جنہوں نے "آسیہ ملعونہ" کو رہا کیا ہے۔

☆ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے عدالتِ عظمیٰ کے اجتماعی وقار کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ مجھے افسوس ہے اور میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو زحمت دی۔ آپ کا بے حد شکریہ عدالت عظمیٰ سے تعاون کرنے پر۔

حکم دیتا ہوں کہ مولانا صاحب کو گاڑی تک چھوڑ آئیں۔

اور پردہ گرتا ہے۔

19 نومبر 2018

☆☆☆

صحافت کہاں ہے۔۔۔؟

آج کل نوجوان صحافیوں کی ایک ایسی کلاس پیدا ہوگئی ہے جو سستی شہرت حاصل کرنے اور صرف ہیرو بننے کے لئے احمقانہ حرکتیں کر رہی ہے، ایسی حرکتیں جن کا صحافت سے دور کا بھی تعلق نہیں، وہ جو کر رہے ہیں، صحافتی اخلاقیات اس کی اجازت دیتی ہے نہ ہی قوانین۔ ایسے بے وقوف لڑکے اپنی حرکتوں کی بنا پر "لتریشن" کرائیں گے اور پھر پوری صحافتی برادری کی بدنامی اور ذلت ہوگئی، الیکٹرانک میڈیا کی ان پھرتیوں کی وجہ سے پہلے ہی صحافت کا شعبہ اتنا بدنام ہو گیا ہے کہ اب خود کو صحافی کہتے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

اگلے روز ایک نوجوان صحافی نے وزیر اعلیٰ پنجاب عثمان بزدار کا عجیب انداز میں پیچھا کرنے اور ان پر فقرے کسنے، جگتیں لگانے کی کوشش کی۔ اچھا سلجھا ہوا نوجوان صحافی ہے، بڑی تہذیب اور شائستگی سے ہر جگہ ادب آداب کے ساتھ ملتے ہیں، مجھے ان کی ویڈیو دیکھ کر افسوس ہوا۔ صحافی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو ہر ایک کی بے عزتی کا لائسنس مل گیا۔ دنیا بھر میں یہ صحافتی ضابطہ ہے کہ اگر کوئی شخص میڈیا کے سوالات کا جواب نہیں دینا چاہتا یا نو کمنٹس کہہ دیتا ہے تو پھر صحافی کو خاموش ہو جانا چاہیے، کسی کے پاس میڈیا کے سوالات کے لئے وقت نہیں تو اس کے اس حق کا احترام کرنا چاہیے، یہ لائسنس کسی کو نہیں مل سکتا کہ مائیک اٹھا کر پیچھے بھاگ کھڑا ہوا جائے۔ ماضی میں یہ روایت اسلام آباد کے انگریزی اخبار سے وابستہ ایک سینئر رپورٹر نے ڈالی، وہ عجیب مضحکہ خیز انداز میں مائیک لئے جواب سے گریز کرنے والے شخص کے پیچھے دوڑ پڑتے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس شخص کو اتنا تنگ کیا جائے بلکہ اور ایک طرح سے ہراساں کیا جا رہا ہے، اسے رُک کر رپورٹر کو ایک عدد جھانپڑ رسید کرنا چاہیے، ایسا کہ جس کے بعد کچھ عرصے

تک ایسا کرنے کی جرات نہ ہو۔ افسوس کہ شائستگی کے مارے یہ لوگ خون کے گھونٹ پیتے چپ کر جاتے اور یوں ایسے صحافتی پیراشوٹرز کے حوصلے بلند ہو گئے۔

آج لاہور کے ایک مقامی چینل کے رپورٹر کی ویڈیو دیکھی اور ہمارے ساتھی صحافتی دوستوں نے چشم دید واقعات سنائے تو حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا۔ ایک بڑے میڈیا گروپ کے لاہور چینل سے وابستہ یہ نوجوان روڈ شو کرتے ہیں اور بدمعاشوں کے انداز میں راہ جاتے لوگوں کو روک کر ان کی بائیک کی چابی نکال لیتے ہیں، وہ اپنی دانست میں ان کا محاسبہ کر رہے ہیں، ٹریفک وارڈن کو ساتھ ملا کر یہ شو کیا جا رہا ہے، کسی کا لائسنس پوچھا، کسی پولیس والے سے ہیلمٹ نہ ہونے کا سوال، کہیں کچھ اور۔ سوال یہ ہے کہ اس رپورٹر کو یہ حق کس نے دیا ہے؟ یہ نری بدمعاشی ہے۔ اب ہو گا یہ کہ کہیں کوئی غصیلا شخص اس رپورٹر کے "کُھنے سیک" دے گا اور پھر یہ آزادی صحافت پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ بھائی لوگو پہلے صحافت کی حدود میں رہنا سیکھ لو، ہاتھ گھمانے کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے، جہاں دوسرے کی ناک شروع ہو۔

2 اکتوبر 2018

☆☆☆

محسن اسلام ذوالفقار علی بھٹو

روزِ قیامت بڑے بڑے علما ذوالفقار علی بھٹو کے مقام و مرتبے پر رشک کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ اپوزیشن تو اسمبلی کا اجلاس بلانے کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

عقیدہ ختم نبوت وہ بنیادی پتھر ہے جس پر اسلام کی عظیم الشان عمارت قائم ہے، اگر اسے ہٹا دیا جائے تو یہ عمارت دھڑام سے نیچے گر جائے گی۔ ہر مسلمان کے عقیدے کا یہ بنیادی جزو ہے کہ وہ اس بات پر ایمان لائے کہ حضرت محمد صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں اور آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

"محمد صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں، وہ تو اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔"

آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی آمد کے ساتھ ہی سلسلہ ءبعثت انبیاء و رسل اپنے کمال کو پہنچ کر اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ قرآن کریم میں ایک سو سے زائد آیات اور ذخیرہ احادیث نبوی صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ میں سو سے زائد احادیث اس عقیدے کا اثبات کر رہی ہیں جن میں پوری تفصیل سے ختم نبوت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اب قیامت تک نہ کوئی نبی پیدا ہو گا نہ کوئی رسول۔

آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے بعد جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرے وہ کذاب، دجال، کافر، مرتد، لعین اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گا۔ بحیثیت مسلمان ہمارے ایمان کی بنیاد اس عقیدے پر استوار ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی بقاء و سلامتی کا راز محبت و غلامی رسول صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ میں مضمر ہے۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی محبت اور اتباع ہی اصل ایمان ہے جس کے بغیر قصرِ ایمان کی تکمیل ممکن نہیں کیونکہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ اللہ کے

آخری نبی اور برگزیدہ بندے ہیں۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے لیے ہی اللہ نے اس جہاں کی بزم سجائی ہے جس میں جابجا حسین و جمیل نظارے ہیں۔ افلاک کی دلکش وسعتیں، گلِ لالہ کی نرم و نازک پنکھڑیاں، کہیں دریاؤں اور سمندروں کا سکوت اور کہیں آبشاروں کے جانفزا مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس جہان رنگ و بو کی تمام تر رعنائیاں اسی ذات کے دم سے ہیں جو پیکر حسن، رحمت اللعالمین، محبوب کبریا، اور خاتم النبیین صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ ہیں۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ پر ایمان ہی دین کی اصل اساس ہے۔ اس بزم ہستی میں وہ مبارک شخصیت جس میں حُسن صورت اور حُسن سیرت کے تمام محامد و محاسن بدرجہ اتم سمو دیے گئے ہیں، پیغمبر آخرالزماں کی ذات گرامی ہے۔ گویا عالم بشریت میں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی ذات ستودہ صفات جامع کمالات بن کر مَنَصَّہ شہود پر جلوہ گر ہوئی اور آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ ہی وہ شاہکار قرار پائے جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

"اس کے جیسا کوئی نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ خداوندی نے اس عبد کامل اور فخر نوعِ انسانیت کی ذات اقدس کو جملہ اوصاف سے مالامال کر دینے سے پہلے آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کی شخصیت کو ظاہری حُسن کا وہ لازوال جوہر عطا کر دیا تھا کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کا حُسنِ صورت بھی حُسن سیرت ہی کا ایک باب بن گیا تھا۔ ربّ کریم نے آپ صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کو وہ جمال بے مثال عطاء فرمایا کہ اگر اس کا ظہورِ کامل ہو جاتا تو انسانی آنکھ اس کے جلووں کی تاب نہ لا سکتی۔

تحفظ ختمِ نبوت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے لے سب سے پہلے خود آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ نے اپنے آخری دور میں جھوٹے مدعیان نبوت کا خاتمہ کر کے امت کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ جب یمن میں اسود عنسی نے سب سے پہلے ختم نبوت سے بغاوت کر کے اپنی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ نے اہل یمن کو اس سے قتال و جہاد کرنے کا باقاعدہ تحریری حکم صادر فرمایا اور بالآخر حضرت فیروز دیلمیؓ نے اس کا خاتمہ کیا۔ صحابہ کرام میں سب سے پہلے تحفظ ختم نبوت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے لیے یارِ غار و بدر و حنین سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ہر قسم کی مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف جہاد بالسیف کیا۔ اس زمانے میں کئی فتنے سر اٹھا رہے تھے لیکن خلیفہ اوّل سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ فقید المثال جرات سے منکرینِ ختمِ نبوت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک اس فتنے کی سر کوبی نہ ہو گئی۔

نبوت کے جھوٹے مدعی مسیلمہ کذاب سے جو معرکہ ہوا اس میں 22000 مرتدین قتل ہوئے اور 1200 کے قریب صحابہ کرامؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ انیسویں صدی کے آخر میں بے شمار فتنوں کے ساتھ ایک بہت بڑا فتنہ ایک جھوٹی اور خود ساختہ نبوت قادیانیت کی شکل میں ظاہر ہوا جس کی تمام تر وفاداریاں اسلام مخالف قوتوں کے لیے وقف ہو گئیں۔ اسلام مخالف قوتوں کو بھی ایسے ہی خاردار خود کاشتہ پودے کی تلاش تھی جس میں الجھ کر مسلمانوں کا دامنِ اتحاد تار تار ہو جائے، اس لیے اسلام مخالف قوتوں نے اس پودے کی خوب آبیاری کی۔ دور حاضر میں انکارِ ختمِ نبوت کا سب سے بڑا فتنہ "فتنہ قادیانیت" ہے جس کا سرغنہ مرزا غلام احمد قادیانی لعین ہے جو 13 فروری 1835ء کو بھارتی پنجاب کے علاقے قادیان میں پیدا ہوا تھا جس نے خود کو نعوذ باللہ آخری نبی کہلوایا جبکہ قرآن مجید میں اللہ کا واضح اعلان موجود ہے کہ اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اور نبوت کا یہ سلسلہ حضرت محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی آمد کے ساتھ ہی اختتام کو پہنچ گیا ہے۔

سورۃ المائدہ کی تیسری آیت واضح دلیل ہے کہ:

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔"

مرزا غلام احمد قادیانی نے تین کلیدی دعوے کیے:

1۔ دعویٰ الہام وحی　　2۔ دعویٰ مسیحیت　　3۔ دعویٰ نبوت ورسالت

مرزا قادیانی نے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ کی طرف سے اسے یہ کام سونپا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طرز پر مخلوق خدا کی اصلاح کرے، پھر آہستہ آہستہ وہ مزید گمراہیوں کی طرف بڑھتا رہا۔ کبھی کہتا کہ مجھ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح حلول کر گئی ہے اور کبھی دعویٰ کرتا کہ مجھے الہامات اور مکاشفات ہوتے ہیں، وہ توریت، زبور، انجیل اور قرآن کی طرح خدا کا کلام ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آخری زمانہ میں قادیان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے اور یہ بھی دعوی کیا کہ مجھ پر دس ہزار سے زائد آیتیں اتاری گئی ہیں۔ قرآن کریم، حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور انبیائے سابقین نے میری نبوت کی شہادت دی ہے اور اس ملعون نے اپنے گاؤں قادیان کو مکہ اور مدینہ کے ہم رتبہ اور اپنی مسجد کو مسجد نبوی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے افضل کہا اور اس بات

کی لوگوں میں تبلیغ کی کہ یہی وہ بستی ہے جسے قرآن کریم میں مسجد اقصی کے نام سے ذکر کیا گیا ہے اور اس کا حج کرنا فرض ہے۔

ایک طویل جدوجہد کے بعد 7 ستمبر 1974ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک ایسا تاریخ ساز فیصلہ سنایا جس نے عقیدہ ختم نبوت کی حقانیت کو واضح کر دیا، اور قادیانی کی جھوٹی نبوت ماننے والوں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔ 30 جون 1974ء کو مولانا احمد شاہ نورانی نے قومی اسمبلی میں قرارداد پیش کی جس کا مقصد تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے جس پر اتفاق رائے سے مولانا مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، احمد رضا قصوری اور مختلف ممبران قومی اسمبلی نے دستخط کیے۔

7 ستمبر 1974ء کی صبح اسپیکر قومی اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی خاں کی صدارت میں اجلاس ہوا جس میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو، وزیر قانون عبد الحفیظ پیرزادہ، وفاقی وزیر برائے مذہبی امور مولانا کوثر نیازی سمیت پوری کابینہ نے شرکت کی۔ قادیانی جماعت کی سربراہی قادیانی خلیفہ مرزا ناصر قادیانی کر رہا تھا۔ طویل بحث کے بعد مرزا ناصر قادیانی نے اپنے کفریا عقائد کا برملا اعتراف کر لیا جس کے نتیجے میں قومی اسمبلی نے تاریخ ساز فیصلے میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا، اور آئین پاکستان کی شق 160(2) اور 260(3) میں اس کا مستقل اندراج کر دیا۔ 7 ستمبر 1974ء کو مسلمانوں کی عظیم جدوجہد کے نتیجے میں دستور پاکستان میں مسلمان کی واضح تعریف کی گئی۔

مسلمان وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اکملیت پر یقین رکھتا ہو اور نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمۡ کو آخری نبی مانتا ہو، کسی بھی ایسے شخص پر ایمان نہ رکھتا ہو جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور غیر مسلم وہ شخص ہے جس کا تعلق عیسائیت، یہودیت، ہندومت، سکھ مت، بدھ مت، پارسی، قادیانی گروپ، لاہوری گروپ یا احمدی گروپ سے ہو (مسلمانوں کے دو "آف شوٹ" شعبہ میں سے نصیریہ اور اختناف میں احمدی اور لاہوری بغیر کسی اگر مگر کے دائرہ اسلام سے خارج ہیں)۔ اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ تمام مسلمانانِ عالم کی ایسے فتنوں سے حفاظت فرمائے اور قیامت کے روز حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمۡ کی شفاعت نصیب فرمائے۔ آمین۔

6 ستمبر 2018

☆☆☆

روحِ محمد ﷺ

مسلم امہ کے باہم انتشار نے ہمیں کیا نہیں دکھایا ہے، امریکہ میں قرآن پاک نذرآتش کیا گیا، افغانستان میں مقدس کتاب کی بے حرمتی کی گئی، مسجدیں پھونکی گئیں اور ان کے دروازے مسلمانوں پر بند بھی کیے گئے، باریش ہونا جرم قرار دیا گیا، برقعہ پوش خواتین کے چہروں سے نقابیں نوچی گئیں اور قرآن پاک پر پابندی عائد کرنے کی دریدہ دہنی کی گئی۔ ڈنمارک سے لے کر پیرس کے چارلی ہیبڈو تک، اور اس سے بھی قبل سلمان رُشدی اور تسلیمہ ملعون نسرین کی کتابوں میں توہینِ رسالت کی ناپاک جسارت کی گئی اور اب ایک بار پھر ہالینڈ میں رسالت مآب صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے خاکے شائع کرنے کی ناپاک جسارت کی گئی ہے سوال یہ ہے کہ کیا مسلم اُمہ کے باہم انتشار، کھینچا تانی، ایک دوسرے کی دستار اچھالنے، ایک دوسرے کے کردار کو کالک ملنے، عدم اتفاق اور عدم اتحاد کی بدولت دشمن اسلام کو ناپاک جسارتیں کرنے کی ہمت ہوئی۔ غور فرمالیں جواب اثبات میں ملے گا۔

وہ ذات اقدس جس نے سب سے پہلے انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا، انسان کے حقوق کی صدا بلند کی، انسانیت کو بین الاقوامی منشور دیا ہو، رنگ و نسل کے بتوں کو پاش پاش کر دیا ہو، عربی و عجمی، گورے و کالے کو ایک صف میں کھڑا کیا ہو، ظالموں کے خلاف شمشیر جہادِ بلند کی ہو، یتیموں، بے کسوں، بے نواؤں کمزوروں کو سینے سے لگایا ہو، غلاموں کی ہتھکڑیاں کھولیں، جن کے چہرے سے سورج کو ضیا ملتی ہے جن کی نظروں کی چمک سے ستارے جگمگانا سیکھتے ہیں، جن کی آنکھوں کی سفیدی سے دن کو اجالا ملتا ہو، جن کے جلال سے بجلیاں کڑکنا اور جن کے جمال سے بادِ نسیم چلنا جانتی ہو، اور جن کے قدموں کے نشانوں سے انسانیت کو منزل کا سراغ ملتا ہو، اس عظیم شخصیت کی شانِ اقدس میں ازلی مردود شیطان

ملعون صفت کمیلش تیواری نے جو بکواس اور ہذیان بکے ہیں، جو اپنے تعفن زدہ منہ اور زہریلی زبان سے اتنا بڑا جرم کیا ہے کہ اسے کائنات کانپ جاتی ہے، خاکے شائع کرنے جیسی ناپاک جسارتیں صرف ایک وجہ سے کی جاتی ہیں کہ:

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ہے

روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

تاریخ اسلام کے اوّل روز سے آج تک دنیائے کفر کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے، کہ روح محمد صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو تنِ مسلم سے نکال لیا جائے، کیونکہ یہی وہ جوہر ہے جو مسلمان کو باطل سے ہر سطح پر نبرد آزما رکھتا ہے، اور اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں رہتا بلکہ راکھ کا ڈھیر ہے اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے باطل نے ہمیشہ کسی بھی حربہ کو استعمال کرنے میں دریغ نہیں کیا، ان حربوں سے حاصل ہونے والی کامیابیوں کا اندازہ بھی لگاتا رہتا ہے، اور یہ اندازہ لگانے کیلیے وہ امتِ مسلمہ کی غیرت و حمیت کا آخری امتحان لیتا ہے، یعنی شانِ رسالت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ میں گستاخی کرتا رہتا ہے اور اس نتیجہ میں امت کے ردعمل سے اپنی کامیابی کا گراف پرکھتا ہے،

مگر روح محمد صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور محبتِ خانوادہ رسالت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کسی ادنیٰ ترین مسلمان کے دل سے بھی نہیں نکالی جاسکتی۔

14 اگست 2018

☆☆☆

دِلّی ہنُوز دُور اَست

قوموں کی تاریخ میں آزادی کا دن بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ زندہ قومیں یہ دن عزم، ولولے اور جوش کے ساتھ مناتی ہیں۔ باوقار قومیں اس دن اپنے لیے نصب العین اور مقاصد کا تعین کرتی ہیں۔ منزل کے حصول کے لیے راہِ عمل متعین کی جاتی ہے اور ماضی کے تجربات اور اقدامات کا محاسبہ بھی کیا جاتا ہے۔

آزادی کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ قوم کے افراد اپنے افکار، نظریات اور فلسفے کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ قوموں کے افکار اور نظریات صدیوں کے سفر کے بعد متعین ہوتے ہیں۔ یہی افکار ان کے تہذیبی ورثے کی بھی آئینہ داری کرتے ہیں۔ آزادی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ افراد اپنے اس تہذیبی ورثے کی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ اس کے ارتقاء میں معاون ہوں اور ان مزاہم قوتوں کا بھی قلع قمع کریں جو اس ورثے کو تباہ کرنے پر آمادہ ہوں۔ آزادی بالعموم تاریخی، سماجی، معاشی اور تہذیبی عوامل کے تحفظ اور بقا کا نام ہوتی ہے۔

اگر ہم پاکستان کے قیام کے لیے چلائی جانے والی تحریک آزادی کا جائزہ لیں تو اس کے کئی ایک پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس تحریکِ آزادی کا بنیادی مقصد سمندر پار سے آئے تجارتی سامراج (جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آیا) سے چھٹکارا پانا تھا کیونکہ تجارتی سامراج تہذیبی اور تاریخی قدروں میں رخنہ انداز ہوتا ہے۔

برصغیر میں آنے والے بیرونی سامراج نے ہمارا تاریخ اور تہذیب سے رشتہ منقطع کر دیا تھا اور یوں تاریخی ارتقاء اور تسلسل میں بسنے والا معاشرہ یکدم گھاٹی میں جا گرا اور وہ اس معاشرے میں منتشر اذہان کی پیدائش کا سبب بنا۔ بیرونی سامراج کا مقصد ہمیں اپنی تاریخی روایت سے الگ کرنا اور ہماری آزادی کا پہلا مقصد خود کو اس روایت کے ساتھ جوڑنا تھا۔ قابض سامراج اور مقبوضہ قوم کی اخلاقی قدروں میں تفاوت پائی جاتی ہے۔ انگریز سامراج نے اپنی اخلاقی قدریں یہاں لاگو کرنے کی کوشش کی برصغیر کا سماج تجارتی اخلاقی قدروں کی نسبت زرعی اخلاقی قدروں کے قریب تھا۔ اس آزادی نے ہمیں یہ موقع دیا کہ ہم اپنی اخلاقی قدروں کا تسلسل قائم رکھ سکیں۔ آزادی کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آزاد ہونے والی قوم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اپنے نظریہ حیات کے مطابق گزار سکے۔ نظریہ حیات قوموں کے من الحیث مجموعی تصور کا نام ہے جو قومیں صدیوں کے تسلسل میں بنا پاتی ہیں۔ نظریہ حیات ہی قیامِ پاکستان کی بنیادی وجہ بنا۔ تصورِ پاکستان دراصل ایک خاص نظریہ حیات سے جڑا ہوا ہے اور وہ نظریہ حیات اسلام کا نظریہ حیات ہے اور اسی نظریے سے پاکستان کی بنیادوں کو سینچا گیا ہے۔

آزادی حاصل کرنے سے اپنی آزادی کی حفاظت کرنا اور اسے برقرار رکھنا زیادہ مشکل اور اہم بھی ہوتا ہے۔ جو قومیں اپنے ماضی کا احتساب کرنا جانتی ہوں وہ اپنی آزادی کی حفاظت بھی خوب کر سکتی ہیں۔ جو قوم مڑ کر اپنی تاریخ کی طرف نہیں دیکھتی وہ اپنے مستقبل کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔ تاریخ کو کوڑے دان میں نہیں پھینکا جا سکتا۔ جب تک ماضی میں سرزد ہونے والے نقصانات کا ازالہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک عمارت میں موجود نقص دور نہیں ہو گا۔ احتساب اسی کا نام ہے۔ آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اپنے نصب العین اور مقاصد کا از سرِ نو تعین کریں۔ پاکستان میں آزادی کا دن منانے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم جہاں سامراج سے آزادی ملنے کی خوشی منائیں وہاں یہ

بھی دیکھا جائے کہ ہم اپنی منزل سے کتنے دور ہیں اور راستے میں کٹھنائیاں کیا ہیں اور ان کا مقابلہ کیسے کرنا ہے؟

بالعموم پاکستانی حکومتیں دستیاب وسائل میں یہ کوشش کرتی رہی ہیں کہ حصولِ پاکستان میں مضمر نظریے کی حفاظت کی جائے اور پاکستان کو ایک فلاحی ریاست میں تبدیل کیا جاسکے۔ آج کے دن حکومت کے ساتھ ساتھ اب ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظریے کی حفاظت کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور ملک میں موجود دہشت گردی کی لہر کو مٹانے اور انتہا پسندی کے اژدھے کو مارنے کے لیے میدانِ عمل میں نکلے۔ جب تک قوم کا ہر فرد اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کرے گا اس وقت تک ہماری آزادی پر آج بھی بیرونی سامراج کی تلوار لٹکتی رہے گی۔ ہماری آج کی جدوجہد سے ہی ہماری کل آنے والی نسل سکھ کا سانس لے پائے گی اور فلاحی ریاست کے قیام کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔

12 اگست 2018

☆☆☆

عاشر عظیم بھی ہجرت کر گیا

احباب! آج پھر ایک محبِ وطن پاکستانی "عاشر عظیم" بالآخر پاکستان سے ہجرت کر گیا۔ ہجرت مقدر بن گئی ہے۔ آیئے اب ہم سب مل کر بھی ہجرت کر جائیں، اور اس وقت واپس آئیں، جب ایک کیپٹن، ایک سول جج، ایک میٹر ریڈر، ماسٹر اللہ دتہ، حنیف خرادیا، بشیر کریانہ سٹور والے اور امجد علی کلرک کی ہر سڑک، ہر ہسپتال، ہر عدالت، اور ہر سرکاری ادارے میں ایک جیسی عزت اور پروٹوکول ہو۔ جب کسی جج، جرنیل کا بھی موٹروے پر چالان ہو۔۔۔

جی ہاں دوستو!

یہ وہ ہی بچپن کی حسین یادوں میں اک ناقابلِ فراموش یاد پی ٹی وی کے شاہکار ڈرامہ سیریل "دھواں" کے خالق ہیں، جو اس وقت کے نوجوان عاشر عظیم تھے۔ عاشر عظیم اس وقت نوجوان آفیسر تھے، اور پاکستان کسٹمز کے محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ڈرامہ سیریل دھواں نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کئے۔ نو آموز اداکاروں نے اپنی لاجواب اداکاری سے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ عاشر عظیم نے اس ڈرامے میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور بطور ڈائریکٹر بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ بطور مصنف بھی انہوں نے دھواں ڈرامہ سیریل کو شاہکار بنادیا۔

اس کے بعد عاشر عظیم طویل عرصہ تک پاکستان کسٹمز میں انتہائی ایمانداری اور حُب الوطنی کے جذبے کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ عاشر عظیم کے متعلق کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان کے اندر پاکستان کی محبت اس قدر رچ بس چکی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنا تعارف پاکستانی کے طور پر کرواتے ہیں۔

آج تک عاشر عظیم نے کسی فورم پر واویلا نہیں مچایا کہ مجھے مذہبی حوالے سے کسی بھی قسم کے امتیاز کا نشانہ بنایا گیا۔ عاشر عظیم ہمیشہ اک محبِ وطن پاکستانی کی شناخت کے ساتھ میڈیا پر آتے ہیں۔

عاشر عظیم کی شوبز کے میدان میں 20 سال کے بعد واپسی ہوئی۔ اور وہ اب کی بار فلم کے ذریعے اپنے وطن کی عوام کو شعور دینے کے لیے میدان میں آئے۔ انہوں نے بطور مصنف وہدایتکار فلم "مالک" بنانے کا اعلان کیا۔ شوبز کے حلقوں میں بے چینی سے فلم کا انتظار کیا جانے لگا۔ آخر کار فلم نے تکمیل کے مراحل طے کیے۔ فلم "مالک" کے پروموز نے دھوم مچادی۔ فلم نگری سے وابستہ نقاد اور تبصرہ نگار پاکستانی فلم انڈسٹری کو دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی نوید سنا رہے تھے، اور خیال تھا کہ فلم "مالک" ایک بڑی سپر ہٹ فلم ہو گی۔ مگر بد قسمتی سے عاشر عظیم کی حب الوطنی کو نئی مشکلات کا سامنا تھا۔

فلم کا مشہور مکالمہ: "میں پاکستان کا عام شہری پاکستان کا 'مالک' ہوں "

فلم کی کامیابی کا اعلان کر رہا تھا۔ ایسے میں سنسر بورڈ کو عاشر عظیم کی اس کاوش میں غداری کی بو آگئی اور ان کی فلم کی نمائش پر پابندی لگا دی گئی۔ عاشر عظیم نے اپنی ایمانداری سے کمائی ہوئی تمام جمع پونجی فلم کی سرمایاکاری پر لگار کھی تھی۔ انہوں نے عدالت میں پیش ہو کر کیس لڑا۔ بالآخر فلم "مالک" ریلیز تو ہوئی مگر سنسر بورڈ کی سنسر شپ کے بعد، سنسر بورڈ کی قینچی نے فلم "مالک" کا بیڑہ غرق کر دیا، نتیجے کے طور پر عاشر عظیم کو مالی خسارہ ہوا۔ فلم بزنس نہ کر سکی اور عاشر عظیم اپنی زندگی بھر کی کمائی سے محروم ہو گئے۔

عاشر عظیم نے اقلیت ہونے کے باوجود اپنی صلاحیت اور ایمانداری سے سول سروس میں خدمات سر انجام دیں۔ انہوں نے انتہائی لگن کے ساتھ پاکستان کی معیشت کو بہتر بنانے کے لئے پاکستان کسٹمز میں رہ کر "سی بی آر" اور دوسرے محکمہ جات کے ساتھ کو آرڈینینس کے ذریعے بہت عمدہ اقدامات کیے۔ عاشر عظیم نے اپنے ویڈیو پیغام میں اپنے ہم وطن پاکستانیوں کو ان وجوہات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن کی وجہ سے پہلے ان کو پاکستان کسٹمز کے محکمے میں کلیدی عہدے سے استعفی دینا پڑا، اور بعد ازاں ان کو انتہائی نامساعد حالات میں اشک بار ہو کر پاکستان سے ہجرت کرنا پڑی۔

میرے نہایت محترم و مکرم قارئین کرام! آپ احباب کو یہ جان کر شاید حیرت ہو گی کہ عاشر عظیم جیسا انتہائی فعال زِیرک اور ایماندار آفیسر آج کینیڈا میں ٹرک چلا رہا ہے۔ مگر عاشر عظیم کے دل میں آج بھی پاکستان کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ کینیڈا میں رہ کر بھی عاشر عظیم سوچتا ہے تو، صرف پاکستان کے لیے، ان کی ہر بات سے پاکستان کے لئے فکر مندی محبت اور عشق کا اظہار ہوتا ہے۔

عاشر عظیم نے پاکستان کسٹمز میں سروس کے دوران 27 دن میں کلیئر ہونے والے کنٹینر کو 4 گھنٹے میں کلیئر کرنے والے نظام پر مبنی سافٹ ویئر بنایا۔ تاکہ پاکستان کی انڈسٹری تیزی سے ترقی کرے۔ عاشر عظیم اور اس کے ساتھیوں کا تیار کردہ منصوبہ آسٹریلیا اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اس سافٹ ویئر کی بدولت پاکستان کسٹمز کا محکمہ شفافیت کی جانب گامزن تھا، کہ کرپشن زدگان نے اپنے مفادات پر ضرب لگتی دیکھ کر عاشر عظیم پر "لغو اور جھوٹ" پر مبنی الزامات لگا کر عہدے سے معطل کر دیا۔

یہاں پر عاشر عظیم نے حب الوطنی کی عظیم مثال قائم کرتے ہوئے کوئی پریس کانفرنس نہیں کی، کسی پروپیگنڈے کا سہارا نہ لیا، خاموشی کے ساتھ عدالت میں اپنے حق کے لئے 3 سال جدوجہد کی، اور 3 سال بعد عدالت نے ان کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے عہدے پر بحال کرنے کا حکم دیا، اور تمام الزامات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے ہوئے کیس خارج کیا۔ مگر عاشر عظیم نے اپنی بحالی کے بعد عہدے سے استعفی دیا اور اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان سے ہجرت کر کے کینیڈا میں مقیم ہو گئے۔ عاشر عظیم اب وہاں ٹرک چلاتے ہیں۔

کاش! عاشر عظیم جیسے محب وطن پاکستانی کو ہجرت کا دکھ نہ اٹھانا پڑتا۔ مجھ خاکسار سمیت عاشر عظیم کے چاہنے والے بھی بے شمار ہیں، اور دل میں تمنا رکھتے ہیں کہ ایک دن عاشر عظیم ضرور پاکستان واپس آئے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ پاکستان کو ایسی قیادت میسر آجائے کہ پھر کسی عاشر عظیم کو ہجرت کا دکھ نہ جھیلنا پڑے۔

12 جولائی 2018

☆☆☆

عہدِ یوسفی تمام ہوا

یوسفی صاحب بھی چلے گئے۔ ضعیف اور علیل تھے، اندازہ ہے کہ چھیانوے سال عمر ہو گی، اندیشہ تھا کہ اس حوالے سے کوئی بری خبر آئے گی، لکھنے لکھانے کے قابل بھی نہیں تھے، مگر جی یہی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے درمیاں موجود رہیں۔ یوسفی صاحب چلے گئے تو دل کو دھچکا سا لگا ہے۔ ہماری جدید ادبی تاریخ میں فیض صاحب کے بعد یوسفی صاحب ہی ''لیجنڈ آف لیجنڈز'' کہلانے کے مستحق تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تحریروں کے انتخاب کے لئے کتابیں دیکھنا شروع کیں تو بار بار پڑھی ہوئی تحریریں دیکھ کر اَش اَش کر اٹھے۔ سوچا کہ انہیں ایک بار پھر یکسو ہو کر پڑھا جائے۔ ہمارے ادب ہی نہیں، شُستہ برجستگی، اردو تہذیبی فقرے بازی، مجلسی مزاح میں یوسفی صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔

دو تین نسلوں کی تربیت ان کی تحریروں سے ہوئی۔ کاش ہمارے بچے بھی اس سرمایہ کی طرف متوجہ ہوں اور ویسا حظ، لطف اٹھائیں جو ہم نے لیا۔ ہماری زندگیوں میں مسرت کے بے شمار لمحات یوسفی صاحب کی دین ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی 4 ستمبر 1923 کو ریاست راجستھان کے شہر جے پور میں پیدا ہوئے تھے۔

انہیں حکومتِ پاکستان میں ادب میں نمایاں کارکردگی پر ہلالِ امتیاز اور ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔

وہ تقسیم کے بعد کراچی آئے تھے اور بینکنگ کے شعبے سے وابستہ رہے، ان کی مزاح پر 5 کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ جن میں چراغ تلے (1961ء)، خاکم بدہن (1969ء)، زرگزشت (1976ء)، آبِ گم (1990ء)، شامِ شعر یاراں (2014ء) شامل ہیں۔

انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم۔اے کیا جس کے بعد انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔

تقسیم ہند کے بعد کراچی تشریف لے آئے اور مسلم کمرشل بینک میں ملازمت اختیار کی۔

ان کے والد ریاست کے پولیٹیکل سیکریٹری تھے اور جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے جو گریجویٹ ہوئے۔

سن 1956ء میں یوسفی صاحب پاکستان آگئے اور مقامی بینک میں ملازمت شروع کی اور ترقی کرتے کرتے بینک کے صدر بن گئے۔

مشتاق احمد یوسفی کا ادبی سفر 1900ء میں مضمون 'صنف لاغر' سے شروع ہوتا ہے جو لاہور سے شائع ہونے والے رسالہ 'سویرا' کی زینت بنا۔ اس طرح مختلف رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

یوسفی تو چلے گئے، ان کا عہد مگر تمام نہیں ہوا، یہ جاری ہے۔ ہم عہد یوسفی ہی میں جی رہے ہیں، جب تک کوئی نیا لیجنڈ سامنے نہیں آتا اور وہ اپنے جملوں کی تراش خراش، تخلیقی قوت سے پچھلوں کو مدھم کرکے نئے حسین نقش بنائے۔

21جون2018

☆☆☆

پانی زندگی ہے

شکوہ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر ہے
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

کتنے دکھ، افسوس اور شرم کی بات ہے کہ مسلمانوں کے ملک پاکستان میں آج نہ صرف یہ کہ پانی ختم ہو چکا ہے، بلکہ درخت اور جنگلات بھی ختم ہونے کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔

ہم مسلمان تو ایسے مبارک اور کریم نبی صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ کے ماننے والے ہیں کہ جن کے لائے ہوئے دین میں درخت لگانے کو صدقہ ءجاریہ فرمایا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "پانی احتیاط سے استعمال کرو، چاہے تم دریا کے کنارے ہی کیوں نہ رہتے ہو"۔

آج منگلا اور تربیلا ڈیم مکمل طور پر خشک ہو چکے ہیں۔ پہلے تو صرف کراچی میں پانی کا قحط تھا، اب پاکستان کے دیگر علاقے بھی پانی کی بوند بوند کو ترس رہے ہیں۔ کالا باغ ڈیم تو ہمیں ہر حال میں بنانا ہی ہے، مگر اس سے پہلے اپنے طرزِ زندگی کو بھی بدلنا ہے۔

پانی کے قحط کے باوجود ہماری پوری قوم بڑے ظلم اور سفاکی سے پانی کو ضائع کرتی ہے۔ قوم کے مزاج میں، بچوں کی تربیت میں، یہ شامل ہی نہیں کیا گیا کہ پانی اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ہے کہ جس کی حفاظت کرنا ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

اب ہمیں اپنے پورے طرزِ زندگی کو بدلنا ہو گا۔ ہماری موجودہ شہری زندگی میں بڑی بے رحمی سے پانی ضائع کیا جاتا ہے۔ وضو آدھے لوٹے میں بھی کیا جا سکتا ہے، غسل آدھی بالٹی میں۔ گاڑی دھونے کیلئے پائپ لگا کر دس بالٹیاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔

بحیثیت ایک قوم اب ہمیں ہر سطح پر پانی کی قدر سکھانی پڑے گی۔ آپ پہلے خود عمل کریں، پھر بچوں کو سکھائیں، سکولوں میں تعلیم دیں، ٹی وی اشتہار بنائیں، سڑکوں پر بینر لگوائیں، ملازمین اور ماسیوں کو پانی ضائع کرنے سے روکیں۔

30 مئی 2018

☆☆☆

اب ہی پراکسی بننے سے توبہ کیجئے

شہزادہ بندر بن سلطان بن عبدالعزیز سعودی شاہی خاندان کے سینئر رکن ہیں، یہ 22 برس امریکا میں سعودی عرب کے سفیر رہے، یہ سعودی عرب کی نیشنل سیکیورٹی کونسل کے سیکریٹری جنرل اور خفیہ ایجنسی کے سربراہ بھی رہے، شہزادے نے افغان جنگ میں مرکزی کردار ادا کیا تھا، اکتوبر 2006ء میں ان کی آپ بیتی،، دی پرنس،، کے نام سے مارکیٹ میں آئی۔

یہ آپ بیتی ان کے برطانوی کلاس فیلو ''ولیم سمپسن'' نے تحریر کی، اس کتاب نے افغان جنگ کے بارے میں پوری دنیا کے تصورات جڑوں سے ہلا دیے، دنیا کو پہلی بار افغان جنگ ''انا اور مفادات'' کی جنگ محسوس ہوئی، شہزادے نے انکشاف کیا، امریکا نے یہ جنگ ڈالروں کے بل بوتے پر لڑی تھی اور ڈالروں کی مدد ہی سے جیتی تھی۔

امریکا اور سعودی عرب افغان مجاہدین کو اسلحہ ، گولہ بارود اور ڈالروں سے نوازتے رہے ، شہزادے نے کتاب میں ''ڈالروں کی برسات'' کے لفظ تک استعمال کیے تھے۔ یہ انکشاف بھی کیا، صدر ریگن اور شاہ فہد کے درمیان معاہدہ ہوا تھا وہ یہ جنگ ہر قیمت پر جیتیں گے اور دونوں اس معاملے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ شہزادے کا کہنا تھا افغان جنگ میں امریکا اور روس کا وہی کردار تھا جو مرغ لڑانے والے دو شکاریوں کا ہوتا ہے۔

شہزادے نے انکشاف کیا سعودی عرب اور امریکا نے انہیں روسی صدر گورباچوف کو جنگ بندی پر راضی کرنے کا مشن سونپا تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں امریکا میں تعینات روسی سفیر ''اناتولی ڈوبرنین'' کو استعمال کیا تھا۔ اناتولی 24 برس سے امریکا میں تعینات تھا اور اسے صدر گورباچوف تک خصوصی رسائی حاصل تھی۔ اناتولی ڈوبرنین امریکا، سعودی عرب اور روس کے درمیان بیک ڈور چینل ڈپلومیسی کا ذریعہ بنا۔

روسی سفیر نے شہزادے کی صدر گورباچوف کے ساتھ ملاقات کا بندوبست بھی کیا، شہزادے نے اعتراف کیا وہ فروری 1985ء میں ماسکو گئے اور انہوں نے صدر گورباچوف کے ساتھ ملاقات کی، اس ملاقات کے شروع میں گورباچوف نے ان پر برسنا شروع کر دیا تھا۔ صدر گورباچوف شاہ فہد کو افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا مجرم قرار دے رہے تھے۔ گورباچوف نے امریکا کو بھی جلی کٹی سنائیں اور سعودی عرب کی جنوبی یمن اور ایتھوپیا کی پالیسیوں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔

شہزادے نے انکشاف کیا ملاقات کے دوسرے دور میں گورباچوف کا رویہ نسبتاً بہتر تھا لہٰذا انہوں نے روسی صدر کو سمجھایا روس کا ایک مسلمان ملک پر قابض رہنا درست نہیں اور افغانستان میں روس کا وہی انجام ہو گا جو ویتنام میں امریکا کا ہوا تھا۔ روس یہ جنگ نہیں جیت سکے گا لہٰذا بہتر ہے وہ یہ جنگ ترک کر کے امن کے لیے کوشش کریں لیکن گورباچوف نے جواب دیا: ”افغانستان میں سعودی عرب کا کوئی مفاد نہیں پھر تم لوگ افغانستان میں 200 ملین ڈالر سالانہ کیوں خرچ کر رہے ہو۔“

شہزادے نے گورباچوف کو سمجھایا: ”جنابِ صدر آپ کی ایجنسیاں آپ کو غلط اطلاعات دے رہی ہیں۔ سعودی عرب افغانستان میں 200 ملین نہیں 500 ملین ڈالر خرچ کر رہا ہے اور اگر ہمیں افغانستان میں مزید رقم خرچ کرنا پڑی تو بھی ہم کریں گے۔“

شہزادے نے لکھا: ”میں نے گورباچوف کو سمجھایا۔ ہم افغانستان میں صرف سرمایہ خرچ کر رہے ہیں جب کہ سوویت یونین اپنے فوجیوں کی قربانی دے رہا ہے۔ امریکا مزید ڈالر چھاپ لے گا اور ہم مزید تیل بیچ کر اپنا نقصان پورا کر لیں گے لیکن روس اس جنگ میں اپنے لوگوں، اپنے وقار، اپنے ساز و سامان اور اپنے سرمائے سے محروم ہو جائے گا، روس اپنا سب کچھ کھو بیٹھے گا۔“

ملاقات کے آخر پر گورباچوف نے کہا: ”اگر ہماری تذلیل نہ کی جائے تو ہم افغانستان سے نکلنے کے لیے تیار ہیں۔“

شہزادے نے انکشاف کیا۔ افغان جنگ کے دوران سعودی عرب اور امریکا پوری دنیا میں خچروں کے سب سے بڑا خریدار تھے۔ افغانستان کا 90 فیصد علاقہ دشوار گزار پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ وہاں باربرداری کا کوئی ذریعہ کام نہیں آتا لہٰذا ہم لوگ خچروں کے ذریعے جنگی

سازو سامان افغانوں تک پہنچاتے تھے۔ ہم نے پوری دنیا سے دھڑا دھڑ خچر خریدے۔ اس خریداری کے نتیجے میں پوری دنیا میں خچر مہنگے ہو گئے۔

شہزادہ بندر بن سلطان کی کتاب نے "ڈیٹرجنٹ پاؤڈر" کا کام کیا اور افغان جنگ کے بارے میں میری نسل کے تمام تصورات دھو کر رکھ دیئے۔ میری نسل افغان جنگ کے دوران پل کر جوان ہوئی تھی لہٰذا ہم اسے کفر اور اسلام کی جنگ سمجھتے تھے لیکن یہ کتاب پڑھ کر معلوم ہوا افغان جنگ کفر اور اسلام کی جنگ نہیں تھی۔ وہ امریکا اور سوویت یونین کی انا کا ٹکراؤ تھا اور سعودی عرب اس ٹکراؤ میں امریکا کا حلیف تھا۔ میری نسل اس جنگ کو پاکستان کا کارنامہ بھی سمجھتی رہی۔

ہم جنرل ضیاء الحق کو اس جنگ کی بنیاد پر بیسویں صدی کا سلطان صلاح الدین ایوبی سمجھتے تھے لیکن شہزادہ بندر بن سلطان نے امریکی ڈالروں کو اس جنگ کی کامیابی کی وجہ قرار دیا اور جنگ میں شریک لوگوں اور ملکوں کو مہرہ ثابت کر دیا۔ میری نسل جنگ میں پاکستان کے کردار کو کلیدی سمجھتی تھی لیکن شہزادے نے صاف اعلان کر دیا:

"اگر سعودی عرب اس جنگ سے ہاتھ کھینچ لیتا تو پاکستان کے لیے افغانستان میں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔"

لہٰذا اس کتاب نے تمام فکری مغالطے دور کر دیے اور ہمیں پہلی بار معلوم ہوا افغان وار کے بعد امریکا نے پاکستان کو تنہا کیوں چھوڑا تھا۔

میری نسل امریکا کو پاکستان کا مجرم سمجھتی آ رہی تھی۔ ہم امریکا پر الزام لگاتے تھے جنگ کے بعد اس نے ہمیں "ٹشو پیپر" کی طرح پھینک دیا لیکن اس کتاب سے معلوم ہوا اس جنگ میں ہمارا کردار "ٹشو پیپر" سے زیادہ تھا ہی نہیں۔ ہم جنگ میں امریکا کے حلیف یا دوست نہیں تھے۔ ہم اس کے "ملازم" تھے اور ہمیں ہماری ملازمت کا باقاعدہ "معاوضہ" ملتا رہا تھا لہٰذا جونہی ہماری جاب ختم ہوئی۔ ہمارے باس نے ہمیں سلام کیا اور ہمیں چھوڑ کر واپس واشنگٹن چلا گیا۔ میری نسل کو پہلی بار معلوم ہوا ہمارے ایک آمر نے اپنی آمریت کو تحفظ دینے کے لیے امریکا کا بازو بننے کا فیصلہ کیا تھا اور امریکا نے نظریہ ضرورت کے تحت نہ صرف اس کے وجود کو تسلیم کر لیا تھا بلکہ یہ اسے تحفظ بھی دیتا رہا۔

افغانستان سے روسی فوجوں کا انخلاء شروع ہوا تو امریکا کو جنرل ضیاء الحق کی ضرورت نہ رہی چنانچہ انہیں شہادت کے رتبے پر فائز کر دیا گیا یوں امریکا اور اس کے حواری پاکستان میں اپنی تمام ذمے داریوں سے سبکدوش ہو گئے اور ہمیں پہلی بار معلوم ہوا افغانستان سے روسی فوجوں کا انخلاء شہزادہ بندر بن سلطان اور گورباچوف کے درمیان ملاقات کی وجہ سے ہوا تھا اور امریکا اور سعودی عرب نے سوویت یونین کے ساتھ مذاکرات میں پاکستان کو اطلاع تک دینا گوارہ نہیں کیا تھا۔

مجھے کل پرنس بندر بن سلطان کی یہ کتاب 12 سال بعد اچانک یاد آ گئی۔ یادداشت کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ سعودی عرب کے ولی عہد پرنس محمد بن سلمان کا تازہ ترین انٹرویو ہے۔ پرنس محمد نے 22 مارچ کو واشنگٹن پوسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا:

"سرد جنگ کے دوران مغرب کو اسلامی دنیا میں وہابیت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہم نے مغرب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے وہابی مدارس اور مساجد کی تعمیر میں سرمایہ کاری کی۔"

آپ اگر اس انٹرویو کو پرنس بندر بن سلطان کی کتاب کے ساتھ جوڑ کر پڑھیں تو آپ کے باقی ماندہ مغالطے بھی دور ہو جائیں گے۔

روس، امریکا، سعودی عرب، پاکستان اور افغان وار لارڈز نے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے لاکھوں بے گناہ افغانوں کا خون بہایا تھا چنانچہ آج یہ تمام ملک اور افغان وار میں شامل تمام لوگ اللہ کے انتقام کا نشانہ بن رہے ہیں۔ آپ تحقیق کر لیں آپ توبہ پر مجبور ہو جائیں گے۔

افغانوں کا خون بیچنے والے ہر شخص کے بچے دست و گریبان بھی ہوئے اور یہ غیر فطری موت بھی مرے، کاش کوئی شہزادہ افغان وار کے "بینی فیشریز" کے انجام پر بھی کوئی کتاب لکھے، وہ کتاب دنیا کی سب سے بڑی "بیسٹ سیلر" ہو گی۔

5 اپریل 2018

☆☆☆

ہمیں بھی یاد کر لینا جب گُلشن میں بہار آئے

آج یومِ قراردادِ پاکستان ہے۔ 23مارچ1940ء کو قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ تحریکِ پاکستان صرف اور صرف مسلمانوں کی تحریک تھی جس کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سی غیر مسلم شخصیات نے بھی تحریکِ آزادی میں قائداعظم اور مسلمانوں کا ساتھ دیا۔

23مارچ1940ء کو لاہور کے منٹو پارک میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں جب مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے حصول کی قرارداد منظور کی گئی تو اس موقع پر غیر مسلم سیاستدان ایس پی سنگھا، ایف آئی چوہدری اور آر اے گومسند بھی موجود تھے۔ اسی طرح دیوان بہادر ستیہ پرکاش سنگھا، راجکماری امریت، چندولال، سی ای گبن، الفرڈ پرشاد، ایف ای چوہدری اور ایس ایس البرٹ جیسے غیر مسلم سیاسی کارکن بھی الگ وطن کے حصول کے لیے مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ تھے۔

قائداعظم کے بااعتماد ساتھیوں میں جوگندر ناتھ منڈل بھی تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد مملکتِ خداداد کے پہلے وزیر قانون بنے۔ اسی طرح متحدہ پنجاب کی اسمبلی کے اسپیکر ایس پی سنگھا نے بھی پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ ان کے علاوہ سر وکٹر ٹرنر کا نام بھی تحریکِ پاکستان کے اہم رہنماؤں کی فہرست میں شامل ہے۔ سر وکٹر پاکستان کے پہلے فنانس سیکرٹری مقرر ہوئے اور ایف بی آر کے چیئرمین بھی رہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان کے پہلے کرنسی نوٹ پر ”وی اے سی ٹرنر“ ہی کے دستخط تھے۔

سر وکٹر کی طرح ایک اور عیسائی رہنماایلون کار نیلیس بھی تحریکِ پاکستان میں پیش پیش تھے۔وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل کے سیکرٹری مقرر ہوئے بعدازاں قائداعظم نے انہیں لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنادیا۔انہیں پاکستان کے پہلے غیر مسلم چیف جسٹس ہونے کااعزاز بھی حاصل ہے۔

یہ بات بھی بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ قراردادِ پاکستان سر ظفراللہ خان نے تحریر کی تھی۔ان کا تعلق بھی اقلیتی احمدی کمیونٹی سے تھا۔پاکستان کا پہلا ترانہ بھی قائداعظم کی خواہش پر ایک غیر مسلم شاعر جگن ناتھ آزاد نے لکھا تھااور یہی ترانہ 14اگست 1947ء کو ریڈیو پاکستان سے نشر بھی ہوا تھا۔

اسی طرح پارسی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے جمشید نسروانجی مہتا کراچی کے پہلے میئر تھے۔انہیں جدید کراچی کا معمار بھی کہا جاتا ہے۔کراچی کا معروف جمشید روڈ انہی کے نام سے منسوب ہے۔پارسی کمیونٹی کو کراچی کی معمار برادری تصور کیا جاتا ہے۔لیڈی ڈیفرن اسپتال، اسپنسر آئی اسپتال ماما پارسی اسکول، این ای ڈی یونیورسٹی اور پارسی ہائی اسکول جیسے باوقار ادارے کراچی کے لیے پارسی کمیونٹی کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

23مارچ2018

☆☆☆

بچے مارتے کیوں ہیں؟ کیسے روکا جائے؟

اکثر بچوں پر یہ مرحلہ آتا ہے کہ وہ زیادہ اشتعال (ایگریشن) کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے بچوں کو اور حتیٰ کہ خود ماں کو بھی مارنے لگ جاتے ہیں۔ پہلے یہ نکتہ سمجھ لیں کہ بچوں کی زندگی میں یہ ایک نارمل بات ہے۔ اُن کی معصوم دنیا میں یہ ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے، اور بعض مثالوں میں تفریح کے حصول کا ذریعہ بھی۔ نتیجتاً، اِس پر آپ کے اندر فرسٹریشن کا پیدا ہونا، اور گاہے دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونا بھی ایک فطری بات ہے۔

اب اس کا ردّ عمل کیسے دینا ہے، ساری پیچیدگی اس میں ہے۔ اگر جواباً آپ گرجنا، برسنا، اور مار پیٹ کرنا شروع کر دیں گے تو یہ آپ کی ناکامی ہے، نہ کہ بچے کو اُس کے کیے پر مزہ چکھا دینے میں کامیابی۔

اگرچہ ایک آدھ بار رُعب دار آواز میں بول جانے، یا کمر پر ہلکی سی چپت لگا کر بچے کو اس مخصوص صورتحال سے ہٹا لینا درست ہو سکتا ہے، تاہم یہ طرزِ عمل اس مسئلہ کا مستقل علاج نہیں۔ بچہ اپنی سطح پر اپنے مسائل کا یہی حتمی اور درست حل لیے ہے کہ مارو اور راستہ بناؤ۔ بچے کی زندگی میں یہ محض ایک مرحلہ ہے جو چند ہفتوں یا چند ماہ تک محیط ہو سکتا ہے۔ ردّ عمل میں اگر آپ کی طرف سے متواتر اشتعال برتا گیا تو ایسا رویّہ بچے کے دل و دماغ میں دو عدد لازمی نتائج کو جنم دے گا:

1۔ آپ اس سے محبّت نہیں کرتے۔ بلکہ دوسروں کی طرفداری کرتے ہیں۔

2۔ ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ سے وہ مزید قائل ہو گا کہ خلافِ مزاج بات پر مشتعل ہونا اور ہاتھ چلا جانا ہی درست طرزِ عمل ہے۔ چونکہ آپ نے اُس کے سامنے یہی کچھ رول ماڈل کیا ہے۔

عام طور پر ردّ عمل یوں دیا جاتا ہے:

آؤ دیکھا نہ تاؤ، پکڑ کر دو چار تھپّڑ جڑ دیئے۔ ساتھ میں ایسے جملے ادا کر دیئے: ”پھر مارا؟! میں تمہارا منہ توڑ دوں گی / گا۔۔۔“

سخت گرجدار آواز میں گالی گلوچ، یا دھمکی آمیز جملے: ”دفع ہو جاؤ، اب مارا تو ہاتھ توڑ دوں گی / گا۔۔۔“

تو پھر کیا کیا جائے؟ درست طرزِ عمل یا مستقل حل / علاج کیا ہے؟

پہلی بات۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ بچے میں ایسا ایگریشن آیا کہاں سے؟ اس نے اپنا سیلف کنٹرول یا اِمپلس کنٹرول کیوں کھو دیا؟ یعنی سب سے پہلے اس کی وجوہ کو کھوجنا ہو گا۔ تب اس کے تدارک پر بات ہو گی کہ مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کیے بنا بچے کو روکا کیسے جائے۔ اس میں بائیولوجیکل، ڈویلپمنٹل، نفسیاتی و حسّیاتی وجوہ حائل ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے تا کہ ایسے بچے کی مدد کی جا سکے۔ اسے ایک مختلف طرزِ عمل پر آمادہ و شفٹ کیا جا سکے۔

ذیل میں درج وجوہات کو خوب توجہ سے پڑھیں، اور دل و دماغ کو پہلے اِس پہلو پر تربیت (گرُوم) کریں کہ بچے ایسا کرتے کیوں ہیں۔ تب اس مسئلہ کے حل پر بات ہو گی۔

بچے کیوں مارتے ہیں؟ پہلی وجہ:

حِسّی یعنی Sensory حسیاتی وجہ سے مراد ہے کہ بعض بچوں میں محسوس کرنے، چھونے، اور ایکسپلور کرنے کا مادّہ دیگر بچوں یا ایک عام انسان سے نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ نتیجتاً، وہ گردوپیش میں موجود اشیا کو دانتوں سے کاٹنے، منہ میں چبانے، بھینچنے، چبھونے، دھکا دینے کے مظاہرے کرتے نظر آئیں گے۔ یہی سب کچھ وہ دوسرے بچوں پر بھی اپلائی کر سکتے ہیں۔ ایسا رویّہ و طرزِ عمل بالعموم ایک مخصوص عمر تک محدود ہو سکتا ہے۔ ذرا زیادہ وقت بھی لے سکتا ہے۔ حل کیا ہے؟

ایسے بچوں کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے کہ کیسے وہ اِن ضروریات کو پورا کر سکیں۔ جیسے: اِن بچوں کو بھینچ کر پیار کرنا، اور ایسے کھلونوں اور کھیلوں کے ساتھ مشغول کرنا ضروری ہے جو اِن کی حسیاتی ضرورتوں کی پیاس بجھا سکیں۔ سات برس تک کی عمر کے بچوں کے ساتھ ہر روز کچھ دیر کھیلنا اور انہیں کھیل کے مواقع فراہم کرنا اہم ترین بات ہے۔ تحریر کے اِس حصے سے آگے کچھ تدابیر شیئر کی گئی ہیں۔

بچے کیوں مارتے ہیں؟ دوسری وجہ: تجسّس

بچہ اس دنیا میں نیا نیا وارد ہوا ہے۔ اس کے معصوم ذہن میں سوالات ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اگر میں اپنے جسم کو یوں حرکت دوں، تب کیا ہو گا؟ اگر اِس شے کو دھکّا دوں، یا نیچے گرا دوں، یا اس پر بوجھ ڈالوں، یا بھینچوں، یا دانتوں سے کاٹوں، تب کیا ہو گا؟ اِس ذہنی رویے کا نشانہ گرد و پیش میں موجود دوسرے بچے بھی بن سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض بڑے بھی۔ بظاہر یہ وجہ پہلی وجہ کیساتھ منسلک ہے۔ تاہم، یہاں فوکس تجسس اور سوال پر ہے، جبکہ وہاں فوکس حسیاتی مادّے کا زیادہ مقدار میں پایا جانا ہے۔

اب یہاں بھی ضرورت ہے کہ ایسے بچے پر کام کیا جائے۔ اسے کسی طور بتایا جائے کہ معاشرتی اعتبار سے قابلِ قبول رویّہ کیا ہے۔ تحریر کے اِس حصے سے آگے کچھ تدابیر شیئر کی گئی ہیں۔

بچے کیوں مارتے ہیں؟ تیسری وجہ: توانائی

چھوٹے بچے بکری کے بچے یا کتّے کے پلّے کی مانند اپنے اندر توانائی لیے ہوتے ہیں۔ وہ ہر روز کچھ دیر ذرا سے جنونی انداز میں اچھل کُود کرتے نظر آئیں گے، اور اپنی حسیاتی ضروریات کو پورا کرنے، کرتب دِکھا کر کارنامہ انجام دینے اور اس پر تحسین کی خواہش لیے نظر آئیں گے۔ اس انرجی کے اخراج کے لیے باقاعدہ اہتمام کرنا ہو گا کہ بچوں کو مثبت انداز کی سرگرمیاں میسر آئیں، جیسے پارک میں لگے جھولے، سلائیڈز وغیرہ جہاں اچھل کُود اور شور شرابا کرنے میں کوئی شے مزاحم نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ تھک جائیں۔ جب یہی کچھ گھر اندر برپا ہو گا تو نری تخریب کاری بن کر رہ جائے گا۔ پہلے سات برس اسے برداشت بھی کرنا ہو گا، مثبت انداز کی سرگرمیاں مہیا کرنا ہوں گی، اور درست رویّے اپنانے کو ذرا اسمارٹ انداز میں رہنمائی بھی دینا ہو گی۔

بچے کیوں مارتے ہیں؟ چوتھی وجہ:
بذریعہ زبان اظہار نہ کر سکنے کی رکاوٹ،

بچے جب تک اپنے جذبہ و احساس کو زبان دے سکنے کے قابل نہیں ہو جاتے، وہ جسمانی حرکات و سکنات کو اپنا ذریعہ اظہار بناتے نظر آئیں گے۔ یہ ایک طرح کا کمیونیکیشن ہے۔ مارنا بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ توجّہ حاصل کرنا، اپنی ضرورت پوری کرانا، یا کسی بات پر احتجاج ریکارڈ کرانا مقصد ہے۔

بچے کیوں مارتے ہیں؟ پانچویں وجہ: نفسیاتی

یعنی خلافِ خواہش بات پر غیر ضروری اشتعال، یا اداسی، ناکامی، خوف، حسد، جذبہِ مسابقت، اور بھوک لگنے پر چڑچڑاہٹ وغیرہ۔ بچہ مارتا ہے چونکہ اُس کے ہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن نہیں پایا جاتا۔ شومئ قسمت، اُدھر والدین کے ہاں بھی اگر آپشنز نہ ہوں کہ ردّ عمل میں ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے علاوہ بھی کسی طور نبٹا جا سکتا ہے تو معاملہ مزید بگڑ جاتا ہے۔

حل کیا ہے؟ سوال و جواب کی طرز پر ریفلیکٹو گفتگو کرنا، اور ایسا بار بار کرنا؛ کسی ایک بچے کی طرفداری ہر گز نہ کرنا، بلکہ بچوں کو ایک دوسرے سے جدا کر لینا۔ جس چیز پر جھگڑا ہے اُسے اپنے قابو میں لے لینا۔ بچوں کو مخالف اطراف میں جانے کا کہنا، اور بعد میں گفتگو کرنا اور قائل کرنا کہ کیوں نہیں مارنا، اور مارنے کی بجائے کیا کرنا ہے۔

—جیسے یہ جملے بار بار ادا کرنا: ''منہ سے بول کر بتایا کریں،'' یا ''مارنے سے pain ہوتا ہے''؛ تھوڑی منصوبہ بندی کر رکھنا کہ بچوں کو کن سرگرمیوں میں مشغول رکھنا ہے، اندازے قائم کرنا کہ فلاں وقت میں فلاں بچہ کس سیچویشن میں ہو گا اور کس چیز کی ضرورت ہو گی؛ خود بچوں کے ساتھ کچھ دیر کھیلنا؛ پارک وغیرہ میں لے جا کر اُنہیں موقع دینا کہ وہ اپنی توانائی مثبت طور کنزیوم کر سکیں؛ چھوٹے چھوٹے قوانین یعنی رُولز بنا کر بچوں سے اُن پر بات چیت کرنا، ایسا بار بار کرنا؛ چیخنے چلانے والے ردّ عمل سے سخت پرہیز برتنا، اور سزا سناتے وقت بھی لب و لہجہ کو نارمل رکھنا؛ سزا کا مطلب ہے بچے سے کوئی privilegeواپس لے لینا۔

—جیسے کھلونا، یا کوئی اور چیز؛ ''ایسا مت کرو'' جیسے منفی جملے بولنے سے گریز، اور اس کی بجائے درست طرزِ عمل اختیار کرنے پر رہنمائی دیتے مثبت جملے ادا کرنا، یعنی بچہ جان لے کہ اُسے کیا کرنا ہے۔

اب ذرا مزید وضاحت۔

پہلی بات: ردّ عمل بچے کے طرزِ عمل پر نہیں، اس کے احساس پر دینا ہوتا ہے۔ جہالت یہ ہے کہ آپ پھٹ پڑیں، مار پیٹ پر اُتر آئیں، یا گالی گلوچ اور دھمکی آمیز زبان استعمال کریں۔ بچہ

بھی یہی کچھ سیکھے گا، اور اگلے وقوعے میں ایگریشن کا اظہار ہی کرے گا چونکہ اُس نے آپ سے عملاً یہی کچھ سیکھا۔ اِس جہالت کے مقابل تعلیم و تہذیب پر مبنی رویّہ یہ کہتا ہے کہ آپ:

اس کی وجوہ کو بہ نظرِ غائر دیکھیں۔ ان وجوہ کو دل و دماغ میں سختی سے جما کر رکھیں۔

مسٹر اینڈ مسز اس موضوع پر آپس میں بات چیت کریں۔ ایک دوسرے سے سوال کریں، بجائے ایک دوسرے پر الزام تراشی کے۔ سات برس تک کے بچے سے آپ ہر روز یہ توقع کریں، اور اس خاطر ذہنی طور پر تیار رہیں۔

خود کو ایجوکیٹ کر لیں کہ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے علاوہ آپشنز کیا ہیں جن کے ذریعے بچے کی مدد کرنا ہے تا کہ وہ اس رویّے سے باہر آ سکے۔ بچے کا دوسرے بچوں کیساتھ تصادم ختم یا کم ہو جائے۔

بچے کے معصوم ذہن کو چھوٹے چھوٹے hooks دینا ہوتے ہیں۔ یہ بچہ کل صبح، اور پرسوں، اور اس سے آگے بھی یہ سب کچھ دوہرائے گا چونکہ مارنا اس کی دنیا میں کمیونیکیٹ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

دوسری بات: رسپانڈ کرنے / ردِّ عمل دینے کے طریقے

اب، ردّ عمل اگر اس کے طرزِ عمل پر نہیں دینا تو اس کے باطن میں برپا جذبہ و احساس کو کیسے رسپانڈ کیا جائے؟

راقم نے اپنی تحاریر اور گفتگو میں متعدّد بار عرض کیا ہے کہ سات برس تک کا بچہ نہیں جانتا دوسروں کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ یہ بول کر بتانا پڑتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے ریفلیکٹو گفتگو کرنا ہوتی ہے، اور اکثر اُس وقت جب بچہ نارمل مُوڈ میں ہو۔

آج دو عدد واقعات ہو چکے۔ آپ نے بچوں کو ایک دوسرے سے جدا کر لیا تھا۔ کل یا پرسوں دوبارہ ویسی ہی صورتحال متشکّل ہو گی۔ چنانچہ آپ حفظِ ماتقدّم کے طور پر درج ذیل نکات پر عمل کریں:

پہلا: ریفلیکٹو گفتگو

بچے کو الگ سے بٹھا کر بات کریں۔ آپ یہاں آئیں۔ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔ آپ نے اپنی بہن کو مارا تھا؟

بچہ: اس نے میری گاڑی لے لی تھی۔ وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں پھر ماروں گا۔

آپ: ہاں جب کوئی گاڑی لے لے تو غصہ تو آتا ہے۔۔۔(یعنی پہلے بچے کی کیفیت کو ایکنالج کریں)۔ لیکن کیا اُس نے آپ کو مارا؟ دیکھیں، مارنے سے pain ہوتا ہے۔ وہ رو پڑی تھی۔

بچہ: اس نے میری گاڑی کیوں لی؟

آپ: میں نے اس کو بتایا ہے کہ آپ کی گاڑی نہ لے، پہلے اجازت لیا کرے۔ لیکن کیا اس نے آپ کو مارا تھا؟

نہیں!

آپ: تو آپ نے بھی اس کو نہیں مارنا۔ مارنے سے سخت pain ہوتا ہے۔ اگر کوئی آپ کو مارے تو آپ کو کیسا لگے گا؟

بچہ: مجھے غصّہ آ گیا تھا۔ بس وہ میری گاڑی نہ لیا کرے۔ ورنہ میں ماروں گا۔

آپ: اگر کوئی آپ کو تھپّڑ مارے تو آپ کو کیسا لگے گا۔ پین ہو گا نا؟ اِس لیے ہاتھ سے مارنا، یا دھکّا دینا سخت بری بات ہوتی ہے۔ آپ اچھے بچے ہو۔ اچھے بچے ہاتھ نہیں چلاتے۔ آپ صرف یہ کہا کریں: میری گاڑی نہیں لو۔ واپس کرو۔ آپ وہیں جم کر کھڑے ہو جایا کریں، اور مجھے آواز دیا کریں۔ ہاتھ روک لیا کریں، اور منہ سے بولا کریں۔

بچہ: مجھے غصّہ آ گیا تھا۔ اُس نے میری گاڑی۔۔۔

آپ: لیکن مارنے سے سخت pain ہوتا ہے، اور پھر سزا بھی ملتی ہے۔ منہ سے بول کر بتایا کریں۔ اچھا میں آپ کو دو طریقے بتاتی ہوں :

پہلا طریقہ: جب آپ کو غصّہ آجائے تو آپ کیا کریں گے؟ دونوں ہاتھ آپس میں یوں باندھ کر سٹیچو بن جائیں گے (بچے کے معصوم ذہن کو چھوٹے چھوٹے hooks دینا ہوتے ہیں)۔ ایک جگہ جم کر کھڑے ہو جائیں۔ پھر مجھے آواز دیا کریں۔ میں بھاگ کر آجاؤں گی۔

اب دوسرا طریقہ: جب زیادہ غصہ آئے تو آپ بھاگ کر اپنے کمرے میں جائیں گے۔ وہاں تکیے کو 10 مکّے مارا کریں گے، خوب زور سے۔ بلکہ 20 مکّے مارا کریں تا کہ غصّہ نکل جائے۔ لیکن بہن کو نہیں مارنا۔ مارنے سے سخت پین ہوتا ہے۔ اور سزا بھی ملتی ہے۔ اب اگر مارا تو سزا ملے گی۔ پھر میں آپ کی گاڑی لے لوں گی۔ تب آپ بھی نہیں کھیل سکو گے۔

یہ ہوتی ہے ریفلیکٹو گفتگو۔

دوسرا نکتہ:

ایسے بچے کو کہانیاں سنائیں جس میں آپ مطلوبہ کردار اسی طور ڈویلپ کریں۔ کہانی کے ہیرو میں ایک آدھ بری عادت ڈال دیں۔ تب بتائیں کہ کیسے ہیرو نے اپنی اُس عادت پر قابو پایا۔

تیسرا نکتہ :

1۔ نظر رکھیں کہ کب ایسی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔

2۔ دونوں بچوں کو الگ الگ ایکٹو ٹیز میں مشغول کرنے کا اہتمام کریں۔

3۔ جب بچے اکٹھے نظر آئیں تو خوشگوار انداز میں بلند آہنگ ہو کر فیملی رُولز اناؤنس کر دیں، یعنی ریمائنڈر دینا ہے۔

4۔ بچّہ پھر بھول جائے گا۔ آپ دوبارہ ریفلیکٹو گفتگو کریں۔ سوال وجواب چلائیں، اور ہر گز مایوس نہ ہوں۔ ایک تدبیر ایک بار کارگر نہیں ہوئی تو اس کا یہ مطلب نہیں آپ اپنے پرانے / جاہلانہ طور طریقوں پر لوٹ جائیں۔

5۔ تیسری بار ہو تو آپ بچے سے اس کا کھلونا لے کر چھپا دیں۔ کچھ دیر رو لینے دیں۔ اور اپنی بات دوہراتے رہیں، تاکہ اس کو غلط طرزِ عمل کے نتائج ازبر ہو جائیں۔ ہر گز کمپرومائز نہ کریں۔ اسے بتائیں کہ اس کی گاڑی تین گھنٹوں کے بعد واپس ملے گی۔ اپنا لب ولہجہ نارمل رکھیں۔ چیخنے چلّانے سے سخت پرہیز برتیں۔ وہی جملے بار بار دوہراتے رہیں۔

چوتھا نکتہ: سات برس تک کے بچوں میں انرجی بھری ہوتی ہے جس کا اظہار وہ جسمانی اچھل کُود کے ذریعے ہی کیا کرتے ہیں۔ سات برس تک کے بچوں کو متواتر پارک وغیرہ تک لے کر جانا، اور گھر میں بھی سرگرمیوں اور کھلونوں کی دستیابی کا اہتمام۔ نیز، ساتھ مل کر کھیلنا۔

14 نومبر 2019

☆☆☆

پردہ

سوشل میڈیا کے توسط علم ہوا کہ کسی اداکارہ کی کوئی فحش ویڈیو لیک ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک غیر شادی شدہ لڑکی سے کوئی بڑی غلطی ہو گئی، شاید وہ ماں بن گئی۔ بعد میں اس کا رشتہ آیا۔ باپ نے حضرت عمر سے کہا کہ میں انہیں بتا نہ دوں کہ لڑکی میں یہ عیب ہے۔

آپ نے کہا کہ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اسے کنواری لڑکی کی طرح بیاہ دو اور اگر دوبارہ تمہاری زبان سے ایسی بات نکلی تو میں تمہیں رجم کر دوں گا۔

کیا ہم اپنی بہن بیٹیوں کا پردہ نہیں رکھ سکتے۔ قرآن کہتا ہے جو لوگ فحاشی کی اشاعت کرتے ہیں یعنی میڈیا یا سماج میں لے آتے ہیں وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سنگین سزا کے مستحق ہیں۔

ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ویڈیو کس نے بنائی، کس کے لئے بنائی، کیوں بنائی اور کس نے اسے لیک کیا۔

اس ویڈیو کو لے کر فیس بک پر جاری حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم عوام الناس کے مختلف گروہوں کے سامنے چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

1۔ جن تک ویڈیو پہنچ چکی ہے ان سے عرض ہے کہ

حدثنا يعقوب بن حميد بن كاسب، حدثنا محمد بن عثمان الجمحي، حدثنا الحكم بن ابان، عن عكرمة، عن ابن عباس، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " من ستر عورة اخيه المسلم، ستر الله عورته يوم القيامة، ومن كشف عورة اخيه المسلم، كشف الله عورته حتى يفضحه بها في بيته".

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائے گا، اور جو اپنے مسلمان بھائی کا کوئی عیب فاش کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کا عیب فاش کرے گا، یہاں تک کہ وہ اسے اس کے گھر میں بھی ذلیل کرے گا" (سنن ابن ماجہ – 2546)

2۔ جن کو ویڈیو کی جستجو ہے ان سے عرض ہے کہ

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ

کہہ کہ (لوگو) آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کر دی ہیں (ان کی نسبت اس نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے) کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ بنانا اور ماں باپ (سے بد سلوکی نہ کرنا بلکہ) سلوک کرتے رہنا اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا کیونکہ تم کو اور ان کو ہم ہی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ ان کے پاس نہ پھٹکنا اور کسی جان (والے) کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے قتل نہ کرنا مگر جائز طور پر (یعنی جس کا شریعت حکم دے) ان باتوں کا وہ تمہیں ارشاد فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (انعام–151)

3۔ جو ویڈیو کو پھیلا یا اوروں کو مہیا کر رہے ہیں ان سے عرض ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی یعنی (تہمت بدکاری کی خبر) پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہو گا۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (نور–19)

رہ گئی وہ اداکارہ تو اس کا معاملہ ربّ کے ساتھ۔

حدثني زهير بن حرب، ومحمد بن حاتم، وعبد بن حميد، قال وعبد بن حميد: حدثني، وقال الآخران: حدثنا يعقوب بن إبراهيم، حدثنا ابن اخي ابن شهاب، عن عمه، قال: قال سالم، سمعت ابا هريرة، يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: " كل امتي معافاة إلا المجاهرين، وإن من الإجهار ان يعمل العبد بالليل عملا، ثم يصبح قد ستره ربه، فيقول يا فلان: قد عملت البارحة كذا وكذا، وقد بات يستره ربه، فيبيت يستره ربه، ويصبح يكشف ستر الله عنه "، قال زهير: وإن من الهجار.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فرماتے تھے: "میری تمام امت کے گناہ بخشے جائیں گے مگر ان لوگوں کے جو اپنے گناہوں کو فاش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آدمی رات کو ایک گناہ کا کام کرے، پھر صبح ہو اور پروردگار نے اس کا گناہ پوشیدہ رکھا ہو وہ دوسرے سے کہے: اے فلانے! میں نے گزشتہ رات کو ایسا ایسا کام کیا، رات کو تو پروردگار نے اس کو چھپایا اور رات بھر چھپاتا رہا، صبح کو اس نے پردہ کھول دیا۔"
(صحیح مسلم-7485)

2نومبر 2019

☆☆☆

ہماری علم دشمنی

شمالی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک فن لینڈ بھی ہے جو رقبے کے لحاظ سے 65 جبکہ آبادی کے اعتبار سے دنیا میں 114 ویں نمبر پر ہے۔ ملک کی کل آبادی 55 لاکھ کے لگ بھگ ہے لیکن آپ کمال دیکھیں اس وقت تعلیمی درجہ بندی کے اعتبار سے فن لینڈ پہلے نمبر پر ہے جبکہ "سپر پاور" امریکا 20 ویں نمبر پر ہے۔

2020ء تک فن لینڈ دنیا کا واحد ملک ہو گا جہاں مضمون (سبجیکٹ) نام کی کوئی چیز اسکولوں میں نہیں پائی جائے گی۔ فن لینڈ کا کوئی بھی اسکول زیادہ سے زیادہ 195 بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ 19 بچوں پر ایک ٹیچر۔ دنیا میں سب سے لمبی بریک بھی فن لینڈ میں ہی ہوتی ہے، بچے اپنے اسکول ٹائم کا 75 منٹ بریک میں گزارتے ہیں، دوسرے نمبر پر 57 منٹ کی بریک نیویارک کے اسکولوں میں ہوتی ہے جبکہ ہمارے یہاں اگر والدین کو پتہ چل جائے کہ کوئی اسکول بچوں کو "پڑھانے" کے بجائے اتنی لمبی بریک دیتا ہے تو وہ اگلے دن ہی بچے اسکول سے نکلوالیں۔

خیر، آپ دلچسپ بات ملاحظہ کریں کہ پورے ہفتے میں اسکولوں میں محض 20 گھنٹے "پڑھائی" ہوتی ہے۔ جبکہ اساتذہ کے 2 گھنٹے روز اپنی "اسکلز" بڑھانے پر صرف ہوتے ہیں۔ فن لینڈ میں ٹیچر بننا ڈاکٹر اور انجینئر بننے سے زیادہ مشکل اور اعزاز کی بات ہے۔ پورے ملک کی یونیورسٹیز کے "ٹاپ ٹین" ماسٹرز کیے ہوئے طالبعلموں کو ایک خصوصی امتحان کے بعد اسکولوں میں بطور استاد رکھا جاتا ہے۔ سات سال سے پہلے بچوں کے لیے پورے ملک میں کوئی اسکول نہیں ہے اور پندرہ سال سے پہلے کسی بھی قسم کا کوئی باقاعدہ امتحان بھی نہیں ہے کہ جس میں ماں باپ بچے کی نیندیں حرام کر دیں۔

ان کے کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے پر پابندی لگ جائے، دروازے کھڑکیاں بند کر کے انہیں گھروں میں "نظر بند" کر دیا جائے۔ گھر میں آنے والے مہمانوں سے ملنے تک پر پابندی عائد کر دی جائے اور گھر میں مارشل لاء اور کرفیو کا سا سماں بندھ جائے۔ پورے ملک میں تمام طلبہ و طالبات کے لیے ایک ہی امتحان ہوتا ہے۔ ریاضی کے ایک استاد سے پوچھا گیا کہ آپ بچوں کو کیا سکھاتے ہیں تو وہ مسکراتے ہوئے بولے "میں بچوں کو خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا سکھاتا ہوں، کیونکہ اس طرح وہ زندگی کے ہر سوال کو با آسانی حل کر سکتے ہیں۔"

آپ جاپان کی مثال لے لیں تیسری جماعت تک بچوں کو ایک ہی مضمون سکھایا جاتا ہے اور وہ "اخلاقیات" اور "آداب" ہیں۔

دوسری طرف آپ ہمارا تعلیمی نظام ملاحظہ کریں جو صرف نقل اور چھپائی پر مشتمل ہے، ہمارے بچے "پبلشرز" بن چکے ہیں۔ آپ تماشہ دیکھیں جو کتاب میں لکھا ہوتا ہے اساتذہ اسی کو بورڈ پر نقل کرتے ہیں، بچے دوبارہ اسی کو کاپی پر چھاپ دیتے ہیں، اساتذہ اسی نقل شدہ اور چھپے ہوئے مواد کو امتحان میں دیتے ہیں، خود ہی اہم سوالوں پر نشانات لگواتے ہیں اور خود ہی پیپر بناتے ہیں اور خود ہی اس کو چیک کر کے خود نمبر بھی دے دیتے ہیں، بچے کے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ بھی خود ہی صادر کر دیتے ہیں اور ماں باپ اس نتیجے پر تالیاں بجا بجا کر بچوں کے ذہین اور قابل ہونے کے گن گاتے رہتے ہیں، جن کے بچے فیل ہو جاتے ہیں وہ اس نتیجے پر افسوس کرتے رہتے ہیں اور اپنے بچے کو "کوڑھ مغز" اور "کند ذہن" کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔

آپ ایمانداری سے بتائیں اس سب کام میں بچے نے کیا سیکھا، سوائے نقل کرنے اور چھاپنے کے؟ ہم 13، 14 سال تک بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے اسمبلی کرواتے ہیں اور وہ اسکول سے فارغ ہوتے ہی قطار کو توڑ کر اپنا کام کرواتے ہیں، جو جتنے بڑے اسکول سے پڑھا ہوتا ہے قطار کو روندتے ہوئے سب سے پہلے اپنا کام کروانے کا ہنر جانتا ہے۔ ہم پہلی سے لے کر اور دسویں تک اپنے بچوں کو "سوشل اسٹڈیز" پڑھاتے ہیں اور معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ بتانے اور سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ ہم نے کتنا "سوشل" ہونا سیکھا ہے؟ اسکول میں سارا وقت سائنس "رٹتے" گزرتا ہے اور آپ کو پورے ملک میں کوئی "سائنس

دان" نامی چیز نظر نہیں آئے گی کیونکہ بد قسمتی سے سائنس "سیکھنے" کی اور خود تجربہ کرنے کی چیز ہے اور ہم اسے بھی "رٹا" لگواتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے میٹرک کلاس کا پہلا امتحان 1858ء میں ہوا اور برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ برصغیر کے لوگ ہماری عقل سے آدھے ہوتے ہیں اس لیے ہمارے پاس "پاسنگ مارکس" 65 ہیں تو برصغیر والوں کے لیے 32 اعشاریہ 5 ہونے چاہئیں۔ دو سال بعد 1860ء میں اساتذہ کی آسانی کے لیے پاسنگ مارکس 33 کر دیے گئے اور ہم 2018 میں بھی ان ہی 33 نمبروں سے اپنے بچوں کی ذہانت کو تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسکولز کے پرنسپل صاحبان اور ذمہ دار اساتذہ کرام سر جوڑ کر بیٹھیں اس "گلے سڑے" اور "بوسیدہ" نظامِ تعلیم کو اٹھا کر پھینکیں، بچوں کو "طوطا" بنانے سے روکیں۔۔۔

2 نومبر 2019

☆☆☆

فتوے سے گریز ہی تقویٰ ہے

اگر 1970 کے الیکشن کے دوران مولانا مودودی کے لیے جمعیت علماء اسلام "سو یہودی ایک مودودی" کے نعرے لگا سکتی ہے۔

اگر صاحب تفہیم القران، قرآن وحدیث، فقہ اور امور شرعی کا عالم، مغرب کے علمی طوفان کا تنِ تنہا مقابلہ کرنے والا، جس نے اکیس سال کی عمر میں مسلمانوں کے جہاد کو ظلم و دہشت قرار دینے کے مغربی پروپیگنڈے کا توڑ "الجہاد فی الاسلام" لکھ کر کیا اور علامہ اقبال کی نظروں میں ایسا معتبر ٹھہرا کہ انہوں نے اپنے دوست چوہدری نیاز علی کو لکھا کہ پٹھانکوٹ میں مولانا مودودی کو زمین عطا کرے تا کہ وہ یہاں آکر کام کریں۔

علامہ اقبال نے چودھری نیاز علی سے جس دوسرے شخص کو پٹھانکوٹ میں زمین دلوائی تھی وہ علامہ محمد اسد تھے تا کہ وہ احادیثِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کا ترجمہ کر سکیں۔ اگر ایسے عظیم مفکر اسلام کو جمعیت العلمائے اسلام کی قیادت اور پرجوش کارکن یہودیوں کے ہم پلہ قرار دے سکتے ہیں تو انکے مقابلے میں عمران خان بچارے کی کیا حیثیت ہے۔ اس کے لئے وضع قطع ہی کافی ہے کہ دیکھو یہود و نصاریٰ سے کتنی ملتی ہے۔

حالانکہ آج بھی اگر یہودیوں کے کسی عالم دین یعنی ربائی کو دیکھیں وہ شکل و صورت سے کسی مسجد کا امام لگے گا۔ ایسی فتوی بازی کا حیرت انگیز مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد پاکستان قومی اتحاد کے وزیروں کو فارغ کر دیا تو مولانا مفتی محمود نے ضیاء الحق کو جو جالندھر کے ایک امام مسجد کا بیٹا تھا اور فوج کی ملازمت کے دوران جامعہ اشرفیہ میں آکر درس لیا کرتا تھا اسے قادیانی قرار دے دیا۔ معلوم نہیں معذرت کی یا نہیں کی، لیکن بعد میں حسن سلوک دوبارہ قائم ہو گیا تھا۔

یکم نومبر 2019

☆☆☆

لبیک

اردو میں حج کے سفر ناموں کی روایت کافی قدیم اور بھرپور ہے یہ روایت بھی فارسی کی دین ہے اردو حج ناموں میں "حاجی محمد منصب علی خان" کا سفر نامہ "ماہِ مغرب" 1817ء پہلا حج نامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ معلوماتی اور واقعاتی سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامے کا اسلوب سیدھا سادھا ہے یعنی اردو کا یہ پہلا حج نامہ رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔

برصغیر دیارِ مقدس سے خاصے فاصلے پر ہے اور انیسویں صدی کے آخر تک سفر کی مناسب سہولتیں بھی میسر نہ تھیں۔ چنانچہ کم زائرین کو یہ سہولتیں اور سعادت نصیب ہوتی تھی۔ اس دور نے آتشِ شوق کو فروزاں کیے رکھا اور حج کے سفر نامے لکھے گئے تو انہیں وصل کا ایک ذریعہ سمجھ کر پڑھا گیا وہ تمام زائرین جو مقدس مقامات دیکھنے کے بعد لوٹتے ہجر و فراق کی کیفیت سے بھی گزرتے اور اس بیان نے حج کے سفر ناموں کے اسلوب کو گداز بنا دیا۔ اس عہد کے قاری کے لیے حج کے سفر نامے نعمتِ عظمیٰ سے کم نہ تھے۔ اور پھر ذرائع آمدورفت کی بدولت یہ سفر آسان ہوا تو حج کے سفر نامے داخلی کیفیت سے آشنا ہوئے۔ حج کے ابتدائی سفر ناموں میں معلومات اور مناسک کی تفصیل ہوتی تھی۔

موجودہ دور کے حج کے سفر ناموں میں تاثرات کی بہتات ملتی ہے۔ آج زبان و بیان کا قرینہ اور سلیقہ خالق کو اپنی باطنی تجربات تحریری شکل میں لانے میں مدد دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ابتدائی سفر نامے "کیا ہے" کی تفصیل تھے جبکہ موجودہ حج ناموں میں "کیا پایا" کی تشریح ملتی ہے۔ اس دور کے حج نامے آپ بیتی کے قریب ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے اُن کا انداز ڈائری جیسا ہے اور مقصد محسوسات، قلب اور تجربات روحانی کا بیان کرنا ہے۔

ان حج ناموں میں ذات کی خود نمائی کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر جگہ ذات کی نفی کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔ عاجزی انکسار حج ناموں کی بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ شورش کاشمیری کا حج نامہ ”شب جائے کہ من بودم“ غلام ثقلین کا ”ارضِ تمنا“ عبد اللہ ملک کا ”حدیثِ دل“ اور ممتاز مفتی کا ”لبیک“ جدید حج ناموں کی چند نمایاں جہتیں پیش کرتا ہے۔

ممتاز مفتی کا ”لبیک“ منفرد حیثیت و اہمیت کا حامل ہے یہ ایک باغی شخص کی قلبی واردات ہے جو اسرار کھولنا چاہتا ہے۔ پردہ اٹھانا چاہتا ہے ہر لمحہ قاری کو اپنا ہمنوا بنائے رکھتا ہے۔ بقول ظہور احمد اعوان:

”مفتی ایک مہم جو کی طرح اپنی ذات کی تسخیری مہم پر رواں تھا۔ اس نے جگہ جگہ رسمی تصورات پر چوٹیں کی ہیں۔ فرسودہ رسومات پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ خارجی رسمیات سے آگے گزر کر داخلی اور روحانی دنیا میں جھانکنے کی کوشش بھی کی ہے۔“

یہ سفر نامہ رپورتاژ کہلایا جا سکتا ہے کیونکہ خود مصنف نے اسے رپورتاژ کہا ہے۔ رپورتاژ سے مراد ایسی تحریر ہے جس میں حقیقت کا بیان داخل اور خارج دونوں کے امتزاج سے ہوتا ہے۔

سفر نامے اور رپورتاژ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سفر نامے میں سفر بنیادی شرط ہے جبکہ رپورتاژ میں روحانی، ذہنی اور جذباتی سفر کی زیادہ اہمیت ہے۔ ممتاز مفتی نے اس سفر نامے کو رپورتاژ کہا ہے دیگر ناقدین نے بھی اس بات کی تائید کی ہے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اپنی کتاب ”داستان تاریخِ رپوتاژ نگاری“ میں اسے رپورتاژ کی حیثیت میں شامل کیا ہے۔ جبکہ انور سدید نے اسے سفر نامے کی حیثیت دی ہے۔ اس رپورتاژ میں خارج سے داخل اور داخل سے خارج کا سفر ملتا ہے۔

ممتاز مفتی 11 ستمبر 1905ء میں بٹالہ میں پیدا ہوئے اور 27 اکتوبر 1995ء کو اسلام آباد میں وفات پائی ممتاز مفتی، مفتی محمد حسین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں پائی۔ استاد کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بنیادی طور پر ایک اچھے افسانہ نگار اور ناول نگار رہے۔ ان کی تخلیقات پر فرائڈ، نطشے، ڈاکٹر اڈلر اور ڈاکٹر یونگ کے اثرات نمایاں ہیں یعنی نفسیات اور جنس ان کے دو بنیادی موضوعات ہیں۔

اس سفر نامے کا ہیرو ''قدرت اللہ شہاب'' ہے۔ جو خود بھی بڑے قلمکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اس سفر میں ان کی حیثیت ایک اعلیٰ و ارفع انسان کے طور پر سامنے آتی ہے۔ مختلف ناقدین نے قدرت کی شخصیت کی چوتھی سمت کو زیر بحث لا کر ممتاز مفتی پر کڑی تنقید کی ہے۔ کہ مفتی نے انہیں ایک ماورائی انسان بنا کر پیش کیا ہے۔ جبکہ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ اس سفر نامے میں قدرت اللہ شہاب ایسا کردار ہے جو تضادات کو ظاہر کرتا ہے۔

ابنِ انشاء، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی چار یاروں کی ٹولی تھی جن میں ہر ایک نابغہ روزگار تھا۔ اور ابنِ انشاء اشفاق احمد اور ممتاز مفتی تینوں کی رائے یہی ہے۔ کہ قدرت اللہ شہاب ایک پر اسرار شخصیت کے مالک تھے۔

ابنِ انشاء اور اشفاق احمد نے قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کی چوتھی سمت سے سمجھوتہ کر لیا اور اس بارے میں بے نیازی برتتے رہے۔ جبکہ مفتی کا رویہ مختلف ہے۔ وہ جاننے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

اس مقدس سفر کے دوران وہ قدرت اللہ شہاب کے ساتھ کافی دیر تک رہے اور بعض ایسے واقعات اور مشاہدات سے واسطہ پڑا کہ قدرت اللہ شہاب کی حیثیت و شخصیت خود بخود بڑی ہوتی گئی۔

اس بارے میں ذوالفقار تابش لکھتے ہیں، مفتی صاحب کا یہ ''رپورتاژ'' پیچیدہ تہ در تہ اور پردہ در پردہ معانی کی ایک ایسی اوڈیسی ہے جس کی مثال کم از کم میرے سامنے نہیں۔ معنی کے پیاز کے چھلکے اترے ہیں۔ مفتی کا یہ ''رپورتاژ'' پڑھ کر جانے مجھے کیوں قرآن کی وہ تمثیل بار بار یاد آئی جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے ایک عجوبہ سفر کا بیان رقم ہے۔

11 اکتوبر 2019

☆☆☆

آج اردو کے نامور شاعر ن م راشد کی برسی ہے

ن۔م راشد کا اصل نام "نذر محمد" تھا اور وہ 1 اگست 1910ء کو اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد اردو شاعری جن شعراء کی بدولت عہد آفرین تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ان میں ن م راشد کا نام بلاشبہ سر فہرست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالی اور آزاد سے لے کر اقبال تک اور اقبال سے لے کر جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی تک اردو نظم نے بڑا تیز سفر کیا لیکن یہ سفر نظم نگاری کی دیرینہ روایات کے دائرے ہی میں ہوا۔ لیکن ن م راشد اور ان کے ایک اور ممتاز ہم عصر میراجی کے یہاں اس نظم نے ہیئت و اسلوب میں ایک ایسی تبدیلی کی بنیاد ڈالی جس نے نظم کا سانچہ ہی بدل ڈالا۔

ن۔م راشد کا پہلا مجموعہ "ماوراء" 1941ء میں شائع ہوا تو گویا یہ ٹھہرے ہوئے تالاب میں ایک پتھر کی مثال ثابت ہوا۔ راشد نے اپنی نظموں میں نہ صرف یہ کہ نظم آزاد کا کامیاب تجربہ کیا بلکہ مغرب کے شعرا بالخصوص انگلستان اور فرانس کے جدید شعرا سے متاثر ہو کر نظم نگاری کے فن کو نئے طریقوں سے برتنے کی کوشش کی۔ یہ نظم سادہ اور بیانیہ شاعری سے خاصی مختلف تھی اور اس نظم میں افسانوی اور ڈرامائی انداز کے جدید اسالیب بدرجہ اتم موجود تھے۔

ابتدا میں ن۔م راشد اور میراجی، دونوں ہی شدید تنقید کا نشانہ بنے لیکن انہوں نے جو بیج بویا وہ بہت جلد تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ خود راشد نے ماورا کے بعد اردو شاعری کو کئی یادگار مجموعے عطا کیے جن میں ایران میں اجنبی، لا انسان اور گماں کا ممکن شامل ہیں۔

ان کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی غیر محسوس طریقے سے ان کا اتباع کیا اور یوں اردو شاعری کے صحن میں نئے دریچے کھلتے چلے گئے۔

ن۔م راشد نے اپنی زندگی مختلف ممالک میں بسر کی۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ لندن میں مقیم تھے۔ جہاں وہ 9 اکتوبر 1975ء کو وفات پا گئے ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی لاش کو نذر آتش کر دیا گیا۔ وہ زندگی بھر دنیا کو چونکاتے رہے تھے اور موت کے بعد بھی اپنی یہ عادت ترک نہ کر سکے۔

9 اکتوبر 2019

☆☆☆

عمران خان، اقوامِ متحدہ اور حرمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

جن لوگوں نے فیلڈ مارشل ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کو سن رکھا ہے وہ اگر جنرل اسمبلی میں عمران خان کی تقریر سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئے تو شائد حق بجانب ہیں کہ یہ دونوں حکمران عمران خان سے زیادہ صاحب مطالعہ اور مختلف ایشوز کا گہرا ادراک رکھتے تھے مگر بے نظیر بھٹو اور جنرل پرویز مشرف سے لے کر آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کے دور میں سن بلوغ کو پہنچنے والا کوئی شخص اگر گزشتہ روز داد نہیں دے پایا تو پرلے درجے کا گاؤدی ہے ،کم ظرف یا بد ذوق۔ بلاول قابلِ معافی ہے کہ وہ دوسروں کا آموختہ دہرانے اور چاپلوسی سے بہل جانے والا اکتیس سال کا بچہ ہے۔

عمران خان کشمیر کا سفیر بن کر جنرل اسمبلی پہنچا، مقدمہ مگر اس نے صرف کشمیریوں کا نہیں، پاکستان، عالم اسلام اور ایک ارب سے زائد عاشقانِ رسول صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا لڑا۔

جب وہ امریکی اور یورپی عوام سے مخاطب ہوا کہ جس طرح یہودیوں کی دلآزاری سے بچنے کے لئے آپ نے ہولوکاسٹ کے ذکر پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے بارے میں بھی سوچیں کہ حضور سرور کائنات صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی اہانت سے ان کے دل دکھتے ہیں، کیونکہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ہمارے دلوں میں بستے ہیں 'تو' میں نے سوچا آج اپنے ایک غلام عمران خان کو اسلام کی حرمت اپنی ناموس اور مسلمانوں کی عزت کا دفاع کرتے دیکھ کر یقیناً سرورِ کائنات صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم خوش ہوں گے۔

29 ستمبر 2019

☆☆☆

قصہ ایک نہ سُنے گئے مشاعرے کا

ربع صدی پہلے کالج کے زمانے میں انوار کلب سیالکوٹ میں روز کا آنا جانا تھا سینکڑوں ادبی و ثقافتی تقاریب میں نہ صرف شرکت رہی بلکہ درجنوں محافل کی میزبانی کا شرف بھی رہا۔

بہت مدت بعد گزشتہ سال کے آخیر میں پرچہ لگا کہ ادب نواز ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ جناب سید بلال حیدر کی کاوشوں سے پاک ٹی ہاوس کی طرز پر انوار کلب سیالکوٹ میں سیالکوٹ ٹی ہاوس قائم کیا گیا ہے جو نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ ہم ایسوں کے لیے برین جمناسٹک کا اکھاڑہ بھی ہے مگر جانے کا اتفاق آج ہوا۔

پاکستان میں علم، ادب، شاعری، ثقافتی ورثہ اور اعلیٰ معاشرتی روایات شدید بحران اور انحطاط پذیری کا شکار ہیں۔ ایسے دگرگوں حالات میں سیالکوٹ ٹی ہاوس غنیمت ہے۔

آج سیالکوٹ ٹی ہاوس کے زیرِ اہتمام انوار کلب سیالکوٹ میں مشاعرے کا اہتمام تھا۔ شریک ہوا مگر شدید مایوسی ہوئی۔ وقت مقررہ پر پہنچ جانے والوں کے لیے پہلا تازیانہ تو شدید حبس کی صورت میں لگا۔ اک طرفہ تماشا یہ مشاعرہ حسبِ روایت تاخیر کا شکار تھا جس کا حل انتظامیہ نے یہ نکالا کہ سیاسی جلسوں میں ''اسٹیج سیکرٹری'' کے فرائض انجام دینے والے صاحب طرز کو میزبانی سونپی اور محترم آتے ہی اردو پر ''حملہ آور'' ہو گئے۔ رہی سہی کسر ان نومولود ''شعراء'' نے نکال دی جنہیں یکے بعد دیگرے میزبان مقامی شاعر کے لاحقے کے

ساتھ اسٹیج پر بلا تار ہا جو واقعی ہی شاعری کو کسی عارضے کی صورت لاحق ہو گئے۔ مزید بیٹھنا دوبھر ہوا۔

ویسے بھی ہم ایسے بھی جانثار نہ تھے کہ ایک "تِل" کی خاطر سالم دوشیزہ پر جانثار ہو جاتے۔ اس لیے استادِ محترم حسن نثار، منصور آفاق، محبوب صابر اور شاہد ذکی (اگر تشریف بھی لا چکے ہیں) سے از حد معذرت کہ ان سے کسبِ فیض کے حصول میں حائل "حبس، اسٹیج سیکرٹری اور مقامی شعرا" کا کوہِ گراں ہم سے پار نہ ہو سکے گا۔

3 اگست 2019

☆☆☆

کتھا ایک سُنے مشاعرے کی

رواں ماہ کے اوائل میں سیالکوٹ میں منعقدہ ایک نہ سنے مشاعرے کا احوال آپکی بصارتوں کی نظر کیا تھا۔ آج قصہ ایک سُنے مشاعرے کا بھی جو ڈرتے ڈرتے سننے گیا۔ ربع صدی سے کچھ زیادہ زمانہ ہوا چاہتا ہے علم و ادب کی نگری کی خاک چھانتے ہوئے۔ کاسہ علم (میری کج ادائی کے سبب) ہنوز خالی ہے۔ مگر یہ سفر ہوتا ہی "ناتمام" ہے۔ بے شمار مشاعرے سننے کا اتفاق ہوا خود بھی "ماڑا موٹا" نثر نگار اور شاعر ہونے کا دعوی دار ہوا (شاعری کے دعوی سے دستبر دار ہو چکا کہ یہ بھاری پتھر مجھ ناتواں سے نہیں اٹھتا)

گزشتہ سے پیوستہ شب پیر محل میں منعقدہ مشاعرہ سننے کا اتفاق ہوا۔ سننے تو مروت و محبت میں گیا تھا مگر اعلیٰ مہمان نوازی، بہترین انتظامات اور حیران کن حد تک (کہ مضافات کے مشاعرے اور مضافاتی شعرا سے توقع نہ تھی) عمدہ اور نُدرتِ خیالات سے مزین شاعری نے اختتامِ مشاعرہ (شب تین بجے) تک نہ اٹھنے دیا۔

جناب انجم سلیمی، واجد نصیر، اظہر فراغ، اکرام عارفی، ندیم ناجد، نصیر بلوچ اور منظر پھلوری صاحب نے نہایت عمدہ شاعری سے سامعین کے قلوب و اذہان کو معطر کیا۔ آباد شہر عمارات، کاروباری اداروں، دکانوں اور شاپنگ سینٹرز سے عبارت نہیں ہوتے۔ بلکہ معاشروں کی شناخت تعلیمی ادارے، چائے خانے، مراکز علم و ادب، کتب خانے اور علمی خانقاہیں ہوا کرتیں ہیں۔

اس قدر شاندار مشاعرہ منعقد کرنے اور احقر کی عزت افزائی پر خصوصا جناب سید ذیشان نقوی، چوہدری عمر سلطان، رمضان جانی اور دیگر علم پرور احباب نہ صرف مبارک باد کے مستحق ہیں بلکہ میں متشکر بھی ہوں۔ اور امید رکھتا ہوں کہ ابتدا اچھی آئندہ ایسی تقاریب پیر محل کی زینت بنتی رہیں گی۔

26اگست2019

☆☆☆

اچھا گمان رکھیئے

حج کے روز سے سوشل میڈیا پر ایک وڈیو وائرل ہے جس میں 4 لوگ احرام باندھے تاش کھیل رہے۔

بس یار لوگوں نے تب سے اس عمل کو تختہ مشق بنا رکھا ہے اور اپنی تربیت اور قومی عادت کے مطابق طنز و مزاح اور تنقید کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ جبکہ گمان یہ ہی ہے کہ اس وقت نہ خطبہ حج ہو رہا ہو گا اور نہ نماز کا وقت ہو گا۔ جبکہ تاش کھیلنا (اگر جوئے کی کوئی صورت نہ ہو، البتہ شائستگی کے خلاف ہے) کوئی جرم نہیں۔ حسن ظن کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

ایسی ہی چیزیں اکثر ہم دیکھتے رہتے ہیں جس میں دوسروں کے بارے بد گمانی، طنز، یا ذاتی زندگیوں پر تنقید ہوتی ہے۔

ہماری تربیت میں کئی کجیاں اور بنیادی اسقام رہ گے ہیں اور اسی کے زیر اثر بد گمانی، طنز، الزام تراشی، بہتان اور غیبت ہماری گھٹی میں پڑے ہیں۔

منصف مزاج اتنے ہیں کہ تمام تر رعایتیں، خوش گمانیاں، مثبت خیالات صرف اپنے اور اپنوں کے لیے روا رکھے ہیں۔

اک طرفہ تماشا یہ ہے کہ آپ معاشرے میں کسی فرد سے یہ پوچھیں کہ آپکی شخصیت میں کوئی خامی ہے (اولاً تو کوئی خامی ہی نہیں ہوتی) تو

کوئی کہے گا کہ میں سچ کہہ دیتا ہوں۔

کوئی کہے گا کہ میں منافق نہیں ہوں۔

کوئی کہے گا کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔

وغیرہ وغیرہ آپ نے غور کیا کہ اپنے بارے میں رائے دیتے ہوئے کمال عاجزی سے خوبیوں کو ہی خامی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ معاملہ کسی دوسرے کا ہو تو وہ جھوٹا، منافق، چور حتیٰ کہ کسی منفی خوبی کا مالک ہی نکلے گا۔

بلکہ اگر کوئی خوبی بھی اس میں کہیں سے نکل آئے تو خامی ہی لگے گی۔ مثلاً خوش اخلاق ڈرامہ ہے دراصل منافق ہے۔

اگر ہم ایک ترقی یافتہ اور رہنے کے قابل معاشرہ چاہتے ہیں تو وقت آگیا ہے کہ اہلیانِ دانش اور اربابِ حل و عقد کو ایک نئے معاشرتی عمرانی معاہدے پر کام کرنا چاہیے نصابی و معاشرتی نصاب از سرنو اور اعلیٰ مذہبی واخلاقی بنیادوں پر مرتب ہونا چاہیے۔

14 اگست 2019

☆☆☆

کشمیر اور دنیا

کشمیر کے موجودہ حالات کے تناظر میں گزشتہ دنوں سے مختلف احباب اور تنظیموں کی طرف سے کچھ پوسٹیں اور اخباری کالم بار بار نظر سے گزر رہے ہیں جیسے:

ملالہ کہاں ہے؟

عورت کے حقوق پر بات بات پر احتجاج کرنے والی آنٹیاں کہاں ہیں؟

پاکستانی لبرلز کہاں مر گے ہیں؟

وغیرہ وغیرہ

اس امر میں تو کوئی دو آرا نہیں کہ مذکورہ بالا اشخاص اور تنظیموں کو ضرور احتجاج کرنا چاہیے۔ مگر جن کی زیادہ ذمہ داری ہے وہ کیوں خاموش ہیں۔

سعودی عرب، یو اے ای، کویت، ایران، افغانستان، عراق، لبنان وغیرہ وغیرہ کی حکومتیں اور عوام کہاں ہیں؟

امت مسلمہ (اگر کہیں ہے) کہاں ہے؟

مولانا فضل الرحمان (آہنی تناظر میں) کہاں ہے؟

تبلیغی جماعت کہاں ہے؟

جماعت اسلامی ہند کہاں ہے؟

جمیعت علمائے ہند کہاں ہے؟

پاکستان کے علاوہ صرف چین نے ایک واضح موقف لیا ہے۔ اور پاکستانی عوام کے علاوہ امریکہ اور یورپ کی سول سوسائٹی سراپا احتجاج ہے۔

باقی رہے نام اللہ کا۔۔۔

پاکستانی ارباب حل و عقد اور دانشوروں کو ضرور اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔
موجودہ زمانے میں ملک مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے اپنے مفادات کے تناظر میں عالمی ایشوز پر رائے اور stand لیتے ہیں۔(البتہ مذہب استعمال ضرور کرلیتے ہیں)۔
کشمیریوں کو بھی صرف اپنے زور بازو پر اپنے حقوق لینے ہیں۔ پاکستان بھی صرف "اخلاقی وسیاسی" محاذ پر کشمیریوں کے ساتھ ہے۔

ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

13 اگست 2019

☆☆☆

تعطیلات۔۔۔زیاں یا امکان؟

تعطیلات محض کتاب بند کرنے کا نام نہیں، یہ دراصل ذہن کھولنے کا وقت ہوتی ہیں۔ یہ وہ وقفہ ہے جس میں بچہ نصابی دباؤ سے آزاد ہو کر سیکھنے کو ایک بوجھ نہیں بلکہ ایک فطری عمل کے طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ مسئلہ تعطیلات کا آجانا نہیں، مسئلہ ان کا بغیر سمت کے گزر جانا ہے۔ یہی دن اگر لاپرواہی میں بیت جائیں تو زیاں بن جاتے ہیں، اور اگر شعور کے ساتھ برتے جائیں تو انہی میں امکانات کے در وا ہوتے ہیں۔

اکثر والدین دو انتہاؤں کے درمیان جھولتے نظر آتے ہیں۔ یا تو بچوں کو مکمل طور پر ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں، یا پھر کھیل کود کے عالم میں بھی انہیں زبردستی کتابوں سے باندھ دینا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکھنا حکم سے نہیں، شوق سے ہوتا ہے۔ اس شوق کو جگانے کے لیے بچے کو خود دریافت کرنے، تلاش کرنے اور انتخاب کرنے کا موقع دینا ضروری ہے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ ٹیب، اسمارٹ فون اور یوٹیوب اب بچوں کی دنیا کا حصہ ہیں۔ ان اسکرینز کو دشمن سمجھنے کے بجائے اگر انہیں درست سمت دے دی جائے تو یہی آلات بہترین اساتذہ بن سکتے ہیں۔ بچہ کچھ وقت اپنی مرضی سے تفریح کرے، یہ اس کا حق ہے۔ والدین کا کام ہر لمحہ helicopter parent بن کر منڈلاتے رہنا نہیں، بلکہ باقی وقت کو بامقصد بنانے کی رہنمائی کرنا ہے۔

اس کے لیے ایک نہایت سادہ مگر مؤثر طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بچے کے ساتھ بیٹھ کر اس کے وقت کا ایک خاکہ تیار کیجیے۔ چاہے وہ ٹیب پر ڈیزائن کیا گیا کوئی ٹیبل ہو یا ایک رنگین شیٹ پر ہاتھ سے بنایا گیا چارٹ، اہم بات یہ ہے کہ بچہ خود اس عمل میں شریک ہو۔ چند دنوں کے لیے دلچسپ تعلیمی ٹاسکس درج کر دیجیے، مثلاً:

- دنیا کے سات عجوبے: نام، مقام اور دلچسپ حقائق
- دنیا کے مشہور ٹاورز: اونچائی، مقام اور تاریخ
- روزانہ تین سے پانچ life hacks
- سولر سسٹم فار چلڈرن
- سپیس سائنس فار کڈز
- سات براعظم اور پانچ سمندر
- گلوب کو سمجھنے کے طریقے

یہ life hacks محض وقتی تفریح نہیں ہوتیں بلکہ سوچنے کا سلیقہ سکھاتی ہیں۔ روزمرہ استعمال کی عام اشیا کو انوکھے زاویے سے دیکھنے کی تربیت دیتی ہیں۔ باورچی خانے کی چیزیں ہوں یا گھر کے معمولات، بچے کی آنکھ میں سوال اور دماغ میں تخلیق جنم لیتی ہے۔ بچے سے کہیں کہ وہ روز تین ایسی ویڈیوز منتخب کرے، انہیں دیکھے، اور پھر یہ بتائے کہ ان میں خاص بات کیا تھی۔ محض ایک مہینے میں وہ نوّے ایسی ویڈیوز دیکھ چکا ہو گا، اور اس کی سوچ میں آنے والی وسعت والدین کو خود حیران کر دے گی۔

اسی طرح تعلیمی پہلو کو بھی نہایت آسان اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ ریاضی یا سائنس کا کوئی ایک ٹاپک لیجیے اور اسے یوٹیوب کی سرچ بار میں لکھ دیجیے۔ تدریسی مواد کی ایسی رنگا رنگ ورائٹی سامنے آئے گی کہ خود والدین بھی سوچ میں پڑ جائیں گے۔ بچے کی کتاب میں موجود ہر سبق کے ساتھ اس کی ویڈیو، صبح ایک، شام ایک، دکھا دیجیے۔ یوں نصاب بوجھ نہیں رہتا، تجربہ بن جاتا ہے۔

مثال کے طور پر decimals سکھانے ہوں تو خود مغزماری کرنے کے بجائے بچے کو کہیے کہ وہ تین بہترین ویڈیوز تلاش کرے، ان کے لنکس محفوظ کرے اور آپ کو دکھائے۔ جب وہ ویڈیوز دیکھ لے تو آپ ایک مختصر سا کوئز لے لیں۔ کام بھی ہو گیا، سیکھنا بھی، اور وہ بھی خوش دلی سے۔

اسی تسلسل میں Khan Academy جیسی ویب سائٹس تو گویا نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔ وہاں موجود تدریسی مواد نہ صرف معیاری ہے بلکہ بچوں کی ذہنی سطح کے عین مطابق،

مرحلہ وار اور دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر والدین خود ایک بار اس پلیٹ فارم کو دیکھ لیں تو اندازہ ہو جائے کہ تعلیم کس طرح خوشگوار تجربہ بن سکتی ہے۔

اسی مقصد کے لیے چند منتخب اور معیاری یوٹیوب چینلز بھی قابلِ توجہ ہیں، جہاں بچوں کے لیے خاص طور پر تعلیمی مواد موجود ہے:

https://www.youtube.com/.../UC57XAjJ04TY8gNxOWf-Sy0Q/videos

https://www.youtube.com/.../UC2QRBzn4OYBaou55-GuZ8Kw/videos

https://www.youtube.com/user/crashcoursekids/videos

https://www.youtube.com/user/watchfreeschool/videos

https://www.youtube.com/user/Smartlearningforall/videos

https://www.youtube.com/user/turtlediarydotcom/videos

https://www.youtube.com/user/TutorVista/videos

یہ چینلز اگر درست نگرانی اور رہنمائی کے ساتھ استعمال ہوں تو اسکرین محض تفریح نہیں، مکمل کلاس روم بن سکتی ہے۔

اور آخر میں یہ بات بھی یاد رہے کہ تعطیلات صرف اسکرین تک محدود نہیں ہونی چاہئیں۔

سفر وسیلۂ ظفر ہے۔

اعزا و اقربا سے ملاقاتیں، تاریخی مقامات کی سیر، اور پہاڑی علاقوں کی فضا۔ یہ سب بچے کی شخصیت سازی میں وہ کردار ادا کرتے ہیں جو کوئی نصابی سبق نہیں کر سکتا۔

سو اصل سوال اپنی جگہ قائم ہے:

تعطیلات: زیاں یا امکان؟

اس کا فیصلہ دنوں کی تعداد نہیں، بلکہ والدین کی بصیرت کرتی ہے۔

☆☆☆

جلنے کڑھنے سے اجتناب کریں

اخلاقیات کے ایک استاد نے طلباء سے پوچھا!

اگر تمہارے پاس 86،400 روپے ہوں اور کوئی لٹیرا ان میں سے 10 روپے چھین کر بھاگ جائے تو تم کیا کرو گے؟

"کیا تم اُس کے پیچھے بھاگ کر اپنی لوٹی ہوئی 10 روپے کی رقم واپس حاصل کرنے کی کوشش کرو گے یا پھر اپنے باقی کے بچے ہوئے 86،390 روپے کو حفاظت سے لیکر اپنے راستے پر چلتے رہو گے؟"

کلاس روم میں موجود اکثریت نے کہا کہ

"ہم 10 روپے کی حقیر رقم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے باقی کے پیسوں کو حفاظت سے لیکر اپنے راستے پر چلتے رہیں گے۔"

استاد نے کہا:

"تمھارا بیان اور مشاہدہ درست نہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ زیادہ تر لوگ اُن 10 روپے کو واپس لینے کے چکر میں ڈاکو کا پیچھا کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر اپنے باقی کے بچے ہوئے 86،390 روپے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔"

طلباء نے حیرت سے استاد کو دیکھتے ہوئے کہا:

"سر، یہ ناممکن ہے، ایسا کون کرتا ہے؟"

استاد نے کہا:

"یہ 86،400 اصل میں ہمارے ایک دن کے سیکنڈز ہیں۔"

کسی 10 سیکنڈز کی بات کو لیکر، یا کسی 10 سینکنڈز کی ناراضگی اور غصے کو بنیاد بنا کر ہم باقی کا سارادن سوچنے، جلنے اور کُڑھنے میں گزار کر اپنا باقی کا سارادن برباد کرتے ہیں یہ والے 10 سیکنڈز ہمارے باقی بچے ہوئے 86،390 سیکنڈز کو بھی کھا کر برباد کر دیتے ہیں۔

اللہ پاک ہمیں روزانہ وقت اور دنیا میں رہنے کی مہلت عطا کرتے ہیں جن پر اللہ کے ساتھ ساتھ ہمارے خاندان، بیوی بچوں، دوستوں اور بہت لوگوں کا حق ہے۔

باتوں کو نظر انداز کرنا سیکھیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کا کوئی وقتی اشتعال، ناراضگی آپ سے آپ کے سارے دن کی طاقت چھین کر لے جائے۔

29جون2019

☆☆☆

مختار مسعود

سیالکوٹ کی مٹی میں جانے کون سی ایسی اکسیر ہے کہ یہاں سے بہت سے انمول ہیروں نے زندگی کا سفر شروع کیا ہے۔ جناب مختار مسعود 1926 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، آپ کو پہلی جماعت میں ہی علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل کروادیا گیا جہاں سے آپ نے ایم اے تک تمام تعلیم حاصل کی۔ طالب علم راہ نما کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں بہت سرگرم رہے۔ 1945ء میں مسلم فیڈریشن علی گڑھ کے جریدہ بیداری کے معاون مدیر تھے۔ اس دوران فیڈریشن کی مجلس عاملہ کے رکن، نائب صدر اور صدر بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد سی ایس پی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور اسسٹنٹ کمشنر سے کمشنر اور سیکرٹری تک کے عہدوں پر کام کیا۔ کمشنر لاہور کی حیثیت سے مینار پاکستان کا کام مکمل کروایا۔ برکت علی محمڈن ہال کی مرمت اور مسجد شہدا کی تعمیر کروائی۔

حکومت مغربی پاکستان میں سیکرٹری وزارت خزانہ اور منصوبہ بندی کمیشن میں سیکرٹری، وزارت تجارت کے سیکرٹری، پٹرولیم وقدرتی وسائل کے سیکرٹری اور صحت وسماجی بہبود کے سیکرٹری رہے۔ صنعتی ترقیاتی کارپوریشن اور زرعی ترقیاتی بینک آف پاکستان کے چیئرمین بھی رہے، واپڈا کے ممبر بھی رہے، ریٹائرمنٹ کے بعد 1987 تا 1989 ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ 1978 تا 1982 تہران میں آر سی ڈی کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کیا۔ متعدد عالمی اداروں کی بین الاقوامی میٹینگز میں نمائندگی کی۔ پانچ کتب کے مصنف ہیں جن میں ''آوازِ دوست'' سب سے مقبول کتاب ہے۔ اس کے

علاوہ ''سفر نصیب''، ''تاریخ کے عینی شاہد''، ''مغربی پاکستان کی سرزمین ایک جائزہ ''اور ''لوح و قلم''جیسی مقبول کتابیں شامل ہیں۔

17 مئی 2019

☆☆☆

حکومت ڈر گئی

"سستی"، نہ کرنا غم نہ کرنا تم ہی غالب ہو اگر تم مومن ہو۔۔۔ القرآن

الحمد اللہ

بحثیت قوم ہم انحطاط پذیری، بے حسی اور سیاسی و مذہبی انارکی کی انتہا پر براجمان ہیں

1۔ پائلٹ کیوں رہا کیا اگر نواز شریف یا فلاں ہوتا تو رہا نا کرتا۔۔۔۔

2۔ حکومت ڈر گئی۔۔۔۔۔

کیا ایسے فیصلے کسی بھی دور میں صرف حکومت کرتی ہے۔ کیا فیصلوں کی بنیاد جذباتی ہوتی ہے۔ کیا جنگ مسائل کا حل ہے اور کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ کیا ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ موجودہ دور میں جنگ ہوتی کیا ہے۔

کچھ نا سمجھے خدا کرے کوئی

آپ پولینڈ کے لوگوں سے پوچھیں یہ آپ کو بتائیں گے جنگ کیا ہوتی ہے۔۔۔ یا کسی یورپی خاندان سے پوچھ لیں جنگ کیا ہے؟ آپ اسکی آنکھوں میں آنسو دیکھیں گے، جرمن فوج نے یکم ستمبر 1939 کو پولینڈ پر حملہ کیا، یہ دوسری جنگِ عظیم کا آغاز تھا، جارح فوج کو 4959 توپوں، 3647 ٹینکوں اور 3300 جنگی طیاروں کی سپورٹ حاصل تھی، یہ آئے اور پولینڈ میں ایک لاکھ 99 ہزار 700 لاشیں بچھادیں، 75 سال بعد بھی اس شہر کی دیواروں پر جنگ کے زخم ہیں، یورپ نے 1939 سے 1945 تک مسلسل 6 برس تک جنگ بھگتی، یورپ امریکہ اور جاپان کے چھ کروڑ لوگ ہلاک ہوئے، امریکہ نے آخر میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر 2 ایٹم بم داغے، 2 منٹ میں 1 لاکھ 40 ہزار لوگ، جبکہ ناگاساکی میں 75 ہزار لوگ ہلاک

ہوئے، اور جو زندہ بچے وہ عمر بھر کے لیے معذور ہوئے، جنگِ عظیم دوم میں یورپ کا کوئی شہر سلامت نہیں بچا تھا، بجلی، پانی، سڑکیں، سکول و کالج، ریلوے کا نظام اور خوراک ہر شے مفقود ہو گئی تھی، آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ جنگ سے پہلے یورپ میں سور نہیں کھایا جاتا تھا، لوگ پورک سے نفرت کرتے تھے، خوراک کی قلت کی وجہ سے پورک کھایا جانے لگا وہ دن ہے اور آج کا دن۔ پورک اب پورے یورپ کی خوراک بن چکا ہے، جنگ کے بعد مرد ختم ہو گئے، چنانچہ یورپ شادی کا سسٹم ختم کرنے پر مجبور ہو گیا، عورت صرف عورت اور مرد صرف مرد بن کر رہ گیا۔

آپ جنگوں کے دوران یہودیوں کی داستانیں پڑھیں، آپ اندر سے دکھی ہو جائیں گے، سینکڑوں ہزاروں یہودی خاندان دو دو برس گٹروں میں رہے انکی ایک پوری نسل گٹروں میں رہی، اور سیوریج کا پانی پی کر کھڑا ہونا سیکھا، آپ یورپ کی پہلی جنگِ عظیم بھی دیکھئے، یہ جولائی 1914 سے 11 نومبر 1918 تک، 4 سال 3 ماہ تک چلی، یورپ نے ان 4 برسوں میں سوا 4 کروڑ لوگوں کی قربانی دی، یہ جنگ آسٹریلیا اور نیوزی کی ہر ماں کی گود اجاڑ گئی، ترکی کا جزیرہ گیلی پولی قبرستان بن گیا، آپ آج بھی وہاں کی مٹی کی مٹھی بھریں تو انسان کی باقیات ملیں گی، آپ ان باقیات سے پوچھیں جنگیں کیا ہوتی ہیں؟ یہ آپکو جنگ کا مطلب سمجھائیں گی اگر پھر بھی پتہ نہ چلے تو آپ ویتنام، افغانستان اور افریقہ کے جنگ زدہ علاقوں سے پوچھ لیں، ویتنام کے لوگوں نے ساڑھے 19 سال جنگ بھگتی، افغانستان پچھلے 35 برسوں سے لاشیں اٹھا رہا ہے، جبکہ افریقہ کے ملکوں نائیجیریا، لائبیریا، سیرالیون، صومالیہ، یوگنڈا، گنی اور سوڈان میں جنگ نے قحط کو جنم دیا، اور یہ قحط افریقہ کے ہر شخص کی آنکھ میں لکھا ہے، آپ ان کی آنکھوں سے پوچھ لیں، جنگ کیا ہوتی ہے؟ یہ آپکو بتائیں گے انسان جب اپنے والد، اپنے بچے اور اپنی بیوی کا گوشت ابال کر کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے یا اپنے لختِ جگر کو زخموں سے رہائی دلانے کے لیے گولی مارتا ہے، اس کا دل اس کی روح کہاں کہاں سے زخمی ہوتی ہے، یہ آپ کو بتائیں گے۔

ہم برصغیر کے پاک و ہند کے لوگوں نے اصلی اور مکمل جنگ نہیں دیکھی، ہندوستان کی تمام جنگیں محدود تھیں، ہم ہر پنجابی سنٹرل ایشیا کے حملہ آور کا اٹک کے پُل پر استقبال کرتے تھے، اسے ہار پہناتے، سپاہیوں کو خوراک اور گھوڑوں کو چارہ دیتے اور سیدھا پانی پت چھوڑ کر

آتے۔ یہ ہماری تاریخ تھی، تاریخ نے پلٹا کھایا اور انگریز پانی پت سے لاہور آ گیا، ہم نے اسے بھی ہار پہنائے، اور سیدھا جلال آباد چھوڑ کر آ گئے، انگریز باقی زندگی افغانوں سے لڑتے رہے اور ہم ان کے سہولت کار بنے رہے۔

ہم 1857 کی جنگِ آزادی کو ہندوستان کی عظیم جنگ سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ دہلی سے 75 کلومیٹر کے فاصلے میرٹھ پر شروع ہوئی اور دہلی پہنچ کر ختم ہو گئی تھی، یہ پوری جنگ دہلی کے مضافات میں لڑی گئی، اور پنجاب، سندھ، ڈھاکہ، ممبئی کے لوگوں کو خبر اس وقت ہوئی جب ملبہ سمیٹا جا چکا تھا، اور بہادر شاہ ظفر رنگون میں

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں

لکھ رہا تھا، ہم اگر 1965 اور 71 کا بھی تجزیہ کریں تو یہ جنگیں کم اور جھڑپیں زیادہ محسوس ہوں گی۔

1965 کی جنگ 6 ستمبر کو شروع ہوئی اور 23 ستمبر کو ختم ہو گئی، پاک و ہند کے لوگ 17 دن کی اس مڈ بھیڑ کو جنگ کہتے ہیں، یہ دونوں ملک ہر سال اس کی سالگرہ مناتے ہیں، 65 کی جنگ میں 4 ہزار پاکستانی شہید اور 3 ہزار بھارتی نشانہ ہوئے تھے، یہ جنگ بھی کشمیر اور پنجاب کے بارڈر تک محدود رہی تھی، عوام کو صرف ریڈیو پر جنگ کی اطلاع ملی۔

1971 کی جنگ 3 دسمبر کو شروع ہوئی اور 16 دسمبر کو ختم ہو گئی، اس جنگ میں 9 ہزار پاکستانی شہید ہوئے اور 26 ہزار بنگالی و بھارتی۔

آپ کبھی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ 13 اور 17 دن کی ان جنگوں کو یورپ کی 4 اور 6 سال لمبی جنگوں کے اور ان تین، چار ہزار، اور 9 ہزار، 26 ہزار لاشوں کو یورپ کی ساڑھے چار کروڑ اور سات کروڑ لاشوں کے سامنے رکھ کر دیکھیں، آپ لاہور اور ڈھاکہ پر حملے کو دیکھیں، آپ 1965 کے پٹھان کوٹ اور چونڈا کے حملے کو دیکھیں پھر ہیروشیما، ناگاساکی، پرل ہاربر، نارمنڈی، ایمسٹرڈیم، برسلز، پیرس، لندن، وارسا، پولینڈ، برلن اور ماسکو پر حملے کو دیکھیں، اور پھر اپنے آپ سے پوچھیں جنگ کیا ہوتی ہے؟ آپ کے جسم کا ایک خلیہ آپ کو جنگ کی ماہیت بتائے گا۔

ہم دونوں ملک جنگ سے ناواقف ہیں، ہم جانتے ہی نہیں کہ جنگ کیا ہوتی ہے، ہم ہر سال، چھ مہینے بعد ہم ایٹم بم نکال کر دھوپ میں بیٹھ جاتے ہیں، بھارت میں چڑی بھی مر جائے تو الزام پاکستان پر تھوپ دیتا ہے، ایل او سی پر معصوم شہریوں، ہندیا کشمیر میں مسلمانوں پر تشدد شروع کر دیا جاتا ہے اور ہم ہر معمولی واقعات پر یہ کہہ کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں کہ ہم نے یہ مواد ایٹم بم "شبِ برات" پر چلانے کے لیے نہیں بنائے، ایٹم بم کیا ہے؟ اور جب یہ پھٹتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ ہیروشیما اور ناگاساکی کے مکینوں سے پوچھیں۔

میں بعض اوقات سوچتا ہوں پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک بڑی جنگ ہونی چاہئے، جی بھر کر جنگی ارمان پورے کر لیں، یہ اپنے سارے ایٹم بم چلالیں تاکہ ایک بار برصغیر کے 110 شہروں کو موہن جوڈارو بنا کر دیکھ لیں، یہ خیر پور سے گوا تک پانچ، دس کروڑ لاشیں بھی دیکھ لیں، یہ عوام کو دوا اور خوراک کے بغیر بلکتا بھی دیکھ لیں، یہ زندگی کو ایک بار پھر بجلی، پانی، سڑک، سکول اور ہسپتال کے بغیر دیکھ لیں۔ یہ پچاس سال تک معذور بچے پیدا ہوتے بھی دیکھ لیں، یہ تب جنگ کو سمجھیں گے، یہ جاپان اور یورپ کے لوگوں کی طرح جنگ کا نام نہیں لیں گے، یہ اس وقت یورپ کی طرح اپنی سرحدیں کھولیں گے اور بھائی بھائی بن کر زندگی گزاریں گے، "راوی اسکے بعد چین ہی چین لکھے گا"، یہ ہیروشیما اور وارسا بننے تک جنگ جنگ کرتے رہیں گے۔

01مارچ2019

☆☆☆

۔۔۔ورنہ اُمیدِ "خزاں" رکھ

20مارچ 2019 کو گورنمنٹ کالج، بہاولپور کے ایسوسی ایٹ پروفیسر خالد حمید کو انہی کے ایک شاگرد نے اُس وقت چھریاں مار کر ہلاک کر دیا جب وہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے، ملزم بی ایس انگریزی کا طالب علم ہے / تھا جبکہ خالد حمید شعبہ انگریزی کے سربراہ تھے۔ قتل کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نئے طلبا کا استقبال کرنے کی غرض سے کالج میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جا رہا تھا جس پر ملزم کو اعتراض تھا کہ یہ تقریب خلافِ اسلام ہے اِس لیے نہیں ہونی چاہیے، اِس معاملے پر اُس کی خالد حمید سے بحث ہوئی جس میں ملزم نے اپنے استاد پر الزام لگایا کہ وہ خلافِ مذہب بات کرتا ہے جو اُس سے برداشت نہیں ہوئی چنانچہ اُس نے اپنے استاد کے سر اور پیٹ میں چھریوں کے وار کر کے قتل کر دیا۔ موقع واردات پر ایک وڈیو بھی ریکارڈ کی گئی ہے جس میں ملزم اُس کمرے میں بیٹھا ہے جہاں پروفیسر کا خون بکھرا ہے، ملزم کے چہرے پر کسی قسم کا ملال نہیں اور وہ اِس بات پر ایک طرح سے فخر کا اظہار کر رہا ہے کہ اُس کا استاد اُس کے ہاتھوں قتل ہوا۔ وڈیو بنانے والے نے ملزم سے جب یہ پوچھا کہ اگر پروفیسر خالد حمید نے کوئی خلافِ مذہب بات کی تھی تو اسے چاہئے تھا کہ وہ کالج انتظامیہ یا قانون کے مطابق متعلقہ اداروں کے علم میں یہ بات لاتا جس کے جواب میں ملزم نے اطمینان سے کہا کہ ملک میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں۔

اب اس قتل کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی مگر کیا ہی اچھا ہو اگر ملزم کا مقدمہ اسی قانون کے تحت چلایا جائے جو اُسکے خیال میں سرے سے موجود ہی نہیں تاکہ کم از کم ملزم کی اِس غلط فہمی کا ازالہ تو ہو سکے۔ آپ کسی ٹاک شو میں بیٹھ جائیں، کسی تقریب میں شرکت کر لیں، نیلام گھر میں مہمان بن کر چلے جائیں یا پھر کسی پی ایچ ڈاکٹر کا مضمون پڑھ لیں جو اُس نے

ملک کے تمام مسائل حل کرنے کی غرض سے لکھا ہو، آپ کو ایک ہی بات ہر جگہ رٹی رٹائی ملے گی کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ جہالت ہے، جب تک ہم ترقی یافتہ ممالک کی طرح اپنے بجٹ کا دس فیصد تعلیم پر خرچ نہیں کریں گے اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے حالانکہ پاکستان کا سب سے بڑا تعلیم کی کمی نہیں بلکہ اُس تعلیم کی زیادتی ہے جو جاہلوں کو جنم دے رہی ہے۔ اِس وقت ہمارے دو کروڑ بچے اسکول نہیں جا پاتے، یہ بچے بنیادی تعلیم سے محروم ہیں اور اگر ہم اپنا تعلیمی بجٹ پوری ایمانداری سے بھی خرچ کر ڈالیں تب بھی ان تمام بچوں کو اسکول تک لانا ممکن نہیں۔

مگر یہ تصویر کا ایک رُخ ہے، دوسرا رُخ یہ ہے کہ جو بچے ہمارے اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں وہ کیا گُل کھلا رہے ہیں! ایک تحقیق کے مطابق سرکاری اسکولوں میں دوسری تیسری جماعت میں پڑھنے والے بچوں کی استعداد کا جب اسی علاقے کے اُن بچوں سے موازنہ کیا گیا جو اسکول نہیں جاتے تھے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں، یعنی اسکول جانے والے بچوں کو بھی ویسی ہی ٹوٹی پھوٹی گنتی آتی تھی جیسی اسکول نہ جانے والے بچوں کو۔ سو جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تعلیم پر زیادہ پیسے خرچ کرنے چاہئیں تو اس دلیل کا صرف اتنا حصہ ہی درست ہے جو دو کروڑ بچوں کو اسکول میں لانے سے یا سرکاری اسکولوں کی حالتِ زار بہتر بنانے سے متعلق ہے، وہ حصہ درست نہیں جو موجود تعلیمی نظام پر سرمایہ کاری کرنے سے متعلق ہے۔ اِس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی کارخانے میں بلڈ پریشر کی دوا بنائی جاتی ہو مگر اس دوا کا اثر نہ ہوتا ہو اور ہم دوا کا معیار درست کرنے کے بجائے کہیں کہ جب تک ایسے مزید کارخانے نہیں لگائے جائیں گے دوا اثر نہیں کرے گی۔

ہمارے بچے صبح سویرے تیار ہوتے ہیں، یونیفارم پہنتے ہیں، اسکول جاتے ہیں، ان کے ماں باپ فیسیں بھرتے ہیں، کاپی کتابوں کا خرچ اٹھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کا بچہ تعلیم حاصل کر رہا ہے، حکومت بھی اپنے کھاتوں میں یہی لکھتی ہے کہ اتنے کروڑ بچے سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں جبکہ حقیقت میں یہ بچے تعلیم حاصل نہیں کر رہے بلکہ محض صبح سویرے اٹھ کر اور مخصوص کپڑے پہن کر ایسی عمارت میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں جس کی دیوار پر اسکول لکھا ہے اور حکومت اور عوام سمجھتے ہیں کہ یہ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے بلڈ پریشر کی دوا بنانے والے کمپنی جو بظاہر دوا بناتی ہو مگر حقیقت میں

placeboبنا رہی ہو اور لوگ placeboاستعمال کر کے سمجھیں کہ وہ دوا استعمال کر رہے ہیں۔ اگر کسی کو یہ بات ہضم کرنا مشکل لگ رہی ہے تو وہ ترقی یافتہ ممالک کا ڈیٹا نکال کر دیکھ لے، دنیا کے جن ملکوں نے ترقی کی بلاشبہ انہوں نے تعلیم کے شعبے میں سرمایہ کاری کر کے ہی ترقی کی مگر جو فائدہ اِن ممالک کو اِس سرمایہ کاری کے نتیجے میں ہوا، اُس کا عشر عشیر بھی ہمیں نہیں ہو رہا۔ مثلاً اگر کسی مغربی ملک نے تعلیم پر سو روپے خرچ کیے اور نتیجے میں اِس کا فائدہ دو سو روپے کی شکل میں بر آمد ہوا تو ہمارے خرچ کیے گے سو روپے پچاس بھی نہیں رہ گئے۔ وجہ اِس کی وہی کہ ہم نے یہ سمجھ کر پیسہ لگایا کہ ہم تعلیم میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں جبکہ حقیقت میں ہم نے جہالت میں انویسٹ کیا اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے، مشعال خان سے لے کر پروفیسر خالد حمید تک اسکول کالجوں کو اُن کے حال پر چھوڑتے ہیں، جامعات کی بات کر لیتے ہیں۔

دنیا بھر میں یونیورسٹیاں تحقیق، جستجو اور علم کا مرکز ہوتی ہیں، وہاں آزاد سوچ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، نئے نئے سوال اٹھائے جاتے ہیں، ان کے جواب تلاش کیے جاتے ہیں، ریسرچ کی جاتی ہے، مقالے لکھے جاتے ہیں، تحریکیں پروان چڑھتی ہیں، دنیا بھر کے موضوعات پر مباحثہ ہوتے ہیں، مذہب، فلسفہ اور سائنس کے مسائل پر بے فکری سے گفتگو ہوتی، یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر ایک کام نہیں ہوتا اور وہ یہ کہ دنیا کی کوئی یونیورسٹی یہ طے نہیں کرتی کہ طالب علم کیا لباس پہنیں گے کیونکہ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد طالب علموں کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اب وہ اسکول کالج کے کھلنڈرے لڑکے لڑکیاں نہیں رہے بلکہ بالغ نوجوان ہو چکے ہیں، ان کی اپنی رائے ہے، ایک سوچ ہے، اپنا بھلا برا وہ خود جان سکتے ہیں، یہ کسی جامعہ کا مینڈیٹ نہیں کہ وہ بیس بائیس برس کی لڑکی کو سمجھائے کہ اسے کیا پہننا چاہئے اور الحمدللہ نہ ہی ہمارے معاشرے کی لڑکیاں ایسی ہیں کہ انہیں اچھے، برے، مہذب یا غیر مہذب لباس کی تمیز نہ ہو۔ پاکستانی لڑکیاں اسی معاشرے میں پلتی بڑھتی ہیں اور انہیں اپنی مذہبی اور معاشرتی اقدار کا احساس ہوتا ہے مگر جس ملک میں جامعات آئے روز ڈریس کوڈ کا تعین کرتی پھریں، حال یہ ہو کہ کوئی آزاد سوچ پروان نہ چڑھنے دی جائے، مکالمے کی اجازت نہ ہو اور طلبہ تو کیا اساتذہ کو بھی تنقیدی شعور کا کوئی تصور نہ ہو، اُس ملک میں یہ دلیل دینا کہ چونکہ ہم تعلیم پر جی ڈی پی کا صرف ڈھائی فیصد خرچ کرتے ہیں اس لئے ہمارا یہ حال ہے، ایسا

ہی ہے جیسے گنے کی فصل کا بیج ڈال کر کپاس کے پھول کی امید کرنا۔ اپنے اسکول، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہم جو نسل تیار کر رہے ہیں اس کی ایک جھلک ہم نے بہاولپور کے گورنمنٹ کالج میں دیکھ لی، پیوستہ رہ شجر سے امیدِ "خزاں" رکھ۔

24مارچ2019

☆☆☆

مختصر مختصر

خواہش کو خبر، افرا تفری، انار کی، زبان و بیان اور انشا پر دازی کی اغلاط، کاپی پیسٹ اور نقل، لاتعداد غیر ذمہ اخبار اور چینلز، غیر تربیت یافتہ صحافی۔ ان سب عناصر کو ملایا جائے تو آج کا۔۔۔ "ابلاغ"۔۔۔۔۔ آواز دے کہاں ہیں۔۔۔۔۔ حمید نظامی، میر شکیل الرحمن، ارشاد حقانی، چراغ حسن حسرت، احمد بشیر، کوئی جائے اور انہیں بلائے۔۔۔۔۔

11اپریل2018

☆☆☆

مختلف ٹی وی چینلز پر جو خواتین مارننگ شوز میں خواتین کو اُمور خانہ داری اور گھر بسانے کے طریقے سکھارہی ہوتیں ہیں ان میں سے اکثر "رمُوز خانہ داری سے نابلد، طلاق یافتہ اور اخلاق باختہ ہیں۔"

21مارچ2018

☆☆☆

زندگی بہت ہی مختصر ہے اسے عداوتوں کے پیچھے ضائع نا کریں۔

7مارچ2018

☆☆☆

سچے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زبان کے ساتھ 'کُتے' باندھ لیے جائیں۔

31 جنوری 2017

☆☆☆

عقل، حاصل، علم اور ذہنی بالیدگی کی ناقدری (یا کمی) ہی بڑی وجہ ہے کہ ہم۔۔۔

1۔ ناخوش ہیں

2۔ چڑچڑے ہیں

3۔ مایوس ہیں

4۔ ذہنی خلفشار کے شکار ہیں

5۔ متفکر ہیں

وہ کون سی قوت ہے جو آپ کے بچے کو عام سے خاص بنا سکتی ہے؟

صرف "اعتماد"

جو والدین اور اتالیق ہی دے سکتے ہیں۔۔۔

31 دسمبر 2019

☆☆☆

زندگی میں کامیاب بنیے اس سے پہلے کہ آپ Motivational Speaker بن جائیں۔

29 دسمبر 2019

☆☆☆

شبانہ اعظمی اور جاوید اختر سے انٹرویو ہو رہا تھا- اینکر نے پوچھا، "شبانہ جی! جیسی شاعری جاوید صاحب کرتے ہیں، یہ تو بڑے رومانٹک ہوں گے؟" شبانہ نے جواب دیا، "رومانس تو کبھی انکو چھو کر بھی نہیں گزرا۔"

اینکر نے حیرت سے جاوید صاحب کی طرف دیکھا، تو وہ بولے،

”دیکھو بھائی! جو لوگ سرکس میں کام کرتے ہیں، وہ اپنے گھر میں اُلٹے تھوڑی لٹکے ہوتے ہیں کیا؟“

24دسمبر2019

☆☆☆

آج کے پاکستان میں اگر قائداعظم محمد علی جناح صاحب اپنا وہ لائف اسٹائل اپنانے کی کوشش کرتے جو اُن کا بمبئی یا کراچی میں تھا تو کوئی بعید نہیں تھا کہ اُن سے بھی کوئی لونڈا وضاحت مانگتا کہ مسٹر جناح ذرا بتائیں تو آپ کا عقیدہ کیا ہے۔۔۔اور پھر پوری ریاست تماشہ دیکھتی؟

19دسمبر2019

☆☆☆

کیا آپ جانتے ہیں یہ ہجوم اس خاتون اسسٹنٹ کمشنر سے اس کے ایمان کی تصدیق کے لئے جمع ہوا ہے۔

اس ہجوم میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ”بیٹے کا نام محمد رکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔۔اپنا عقیدہ واضح کرو۔“

ہمارا مسئلہ یہ ہے کل ہم جس کو کافر سمجھتے ہیں، چاہتے ہیں کہ وہ بھی خود کو کافر سمجھے اور اپنے کفر کا اعلان بھی کرے۔

محترم افتخار عارف فرماتے ہیں۔۔۔

رحمتِ سیدِ لولاکؐ پہ کامل ایمان۔۔!
امتِ سیدِ لولاکؐ سے خوف آتا ہے

15دسمبر2019

☆☆☆

رب العزت نے جن نعمتوں سے انسان کو نوازا ہے ان میں سے ایک "بھول" جانے کی عادت اور دوسرا "در گزر" کرنا ہے۔

ضروری نہیں کہ ہر بات یاد رکھی جائے اور نا یہ ضروری ہے کہ ہر بات جو کوئی ہمیں کہتا ہے یا کسی دوسرے کو کہتا ہے اسے یاد رکھا جائے۔ اِس پر ری ایکٹ کیا جائے اور اپنی اور دوسروں کی زندگی کو اجیرن کیا جائے۔

ججمنٹل بھی صرف اپنے بارے ہی ہوا جاسکتا ہے۔ دوسروں کے بارے صرف "خدا" ہی ہو سکتا ہے۔

29 دسمبر 2019

☆☆☆

مار نہیں پیار!

جو تھا خوب بتدریج وہی نا خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا طریق

جس معاشرے میں استاد اور کتاب کی عزت نہیں رہی وہ معاشرہ گزشتہ 78 سالوں سے ایشین ٹائیگر بننے کا "لا حاصل خواب" دیکھ رہا ہے۔۔۔ نا والدین محفوظ ہیں نا استاد پھر معاشرہ کیسے محفوظ اور رہنے کے قابل ہو سکتا ہے

23 نومبر 2019

☆☆☆

ہم کل میں جیتے ہیں، یا گزرے کل میں یا آنے والے کل میں رہتے ہیں۔ Haves نہیں Have Not میں ہماری زندگیاں بیت جاتی ہیں۔ بلیک گاڑی ہو تو سرخ چاہیے۔ اولاد نا ہو تو صرف بیٹی ہی مل جائے۔ خدا بیٹی دے دے تو بیٹے کی خواہش میں بیٹی بھول جاتی ہے۔ گھر مل

جائے تو گھر کا کم سامان خوش نہیں ہونے دیتا اور سب کچھ مل جائے تو لوگوں سے شکوے جینے نہیں دیتے۔

19 نومبر 2019

☆☆☆

عدالت جب بھی یک لخت سپید سے سیاہ اور سیاہ سے سپید ہوتی ہے تو معاشرہ صدیوں کے لیے مزید انحطاط کے کنویں میں گر جاتا ہے۔ اور پاکستان میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔

19 نومبر 2019

☆☆☆

لوگوں کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ پھر وہ دل و نظر سے اُترنا شروع ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ہر رنگ میں اچھے ہوتے ہیں۔

3 نومبر 2019

☆☆☆

ابّا جس "نکے" کو گود سے گرا دیتا ہے۔ وہ ہی نِکا کہتا پھرتا ہے کہ ابّا ٹھیک نہیں۔

2 نومبر 2019

☆☆☆

مماثلت محض اتفاقیہ ہے ------

کہانی آپ اُلجھی ہے کہ اُلجھائی گئی ہے
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشا ختم ہو گا!
یہ سب کٹھ پتلیاں رقصاں رہیں گی رات کی رات

سحر سے پہلے پہلے سب تماشا ختم ہو گا!
تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ پردہ کب گرے گا، کب تماشا ختم ہو گا!

سیاست اور زندگی مکالمے سے عبارت ہے۔ اور بقا کے لیے مکالمے سے گریز ممکن نہیں
۔

"اگے تیرے بھاگ لچھیئے۔۔۔"

13 اکتوبر 2019

☆☆☆

جب تک خود کو سُرمے کی طرح باریک نہیں کرو گے۔
تب تک محبوب تجھے اپنی آنکھوں میں لگائے گا کس طرح؟

8 اکتوبر 2019

☆☆☆

ہم، ہمارا ناقص نظامِ تعلیم، غیر تربیت یافتہ والدین اور اتالیق اعلی درجے کی تعلیم و تربیت کے کوہِ گراں کو سر کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

ہمارے بچے بہت زیادہ ظلم سہنے والے مظلوم ہیں۔ گھر میں ماں باپ کی ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ، سکول میں اساتذہ کی سختی اور مارپیٹ اور اکیڈمی میں بھی ٹیچر کی بدزبانی، طعنے اور سزائیں۔ شام میں مدرسے کے قاری صاحب کا تشدد۔۔۔۔!

ذہنی اور جسمانی تشدد کے بعد ہم طلبا و طالبات سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ اچھے انسان بنیں گے۔ ظلم اور تشدد میں پرورش پانے والے بچے کبھی بھی ملک و معاشرہ کے بہترین انسان نہیں بن سکتے۔۔۔!

بچوں کو اچھا انسان بنانا ہے تو پہلے والدین، اساتذہ اور قاری صاحب کو اچھا انسان بنانا پڑے گا، جو بچوں کو اپنے خوف اور ڈر میں مبتلا رکھتے ہیں۔

23 ستمبر 2019

☆☆☆

کل کے یزید کے لیے وجودِ حسین علیہ السلام برداشت نہ تھا۔ اور آج کے یزید کے لیے ذِکرِ حسین علیہ السلام ناقابلِ برداشت ہے۔

18 ستمبر 2019

☆☆☆

شرک کا اصطلاحی مفہوم قوانین و اقدار خداوندی میں انسانوں کی اپنی خواہشات کی شراکت ہے۔

مثلاً عدل حق ہے اور Selected Justice شرک ہے۔

اسی طرح احترامِ آدمیت حق ہے اور محض کسی ایک طبقے کا احترام شرک ہے۔

ہمیں سچ کا ہیضہ لاحق ہے۔ مگر دوسروں کے بارے میں!

16 ستمبر 2019

☆☆☆

حصولِ علم اس لیے ضروری نہیں کہ اس سے رزق ملتا ہے۔ رزق تو ان پڑھ، نیم خواندہ اور جاہل کے پاس بھی وافر ہو سکتا ہے۔ اور اکثر ہوتا بھی ہے۔

علم تو زندگی ہے علم تو آگاہی ہے،

اور اللہ کے ہاں علم سے ہی انسان کے درجات مرتب ہوتے ہیں۔

”کیا علم والے اور بغیر علم والے برابر ہو سکتے ہیں؟“ (القران)

ہرگز نہیں!!!

10 ستمبر 2019

☆☆☆

ہم بڑی حد تک ویسے ہی ہوتے ہیں جیسی ہماری سوچیں ہوتی ہیں۔
حتیٰ کہ ہم بیمار بھی اتنے ہی ہوتے ہیں جتنا ہم محسوس کرتے ہیں۔

9 ستمبر 2019

☆☆☆

المیہ

احساسِ برتری، احساسِ مظلومیت اور نیکی کے تکبر نے مسلم فرد اور معاشرے کی اخلاقیات تباہ کر دی ہیں۔

بالکل ویسے ہی جیسے پاکستانی عورت ڈرامہ دیکھتے ہوئے مظلوم ترین کردار میں خود کو تصور کر لیتی ہے اور پھر شوہر، ساس، سسر، بھاوج، دیورانی، باس، جہاں جاب کرتی ہے وہاں کی انتظامیہ، سڑک پر کھڑا ٹریفک سارجنٹ بلکہ ہر ایک کردار (ماسوائے اپنے بچوں، والدین اور ایک آدھ سہیلی کے) سازشی لگتا ہے۔

اسی طرح مسلم فرد اور معاشروں کو (اپنے علاوہ) اپنی انحطاط پذیری کی واحد وجہ ہنود، یہود اور انگریز کی سازشیں لگتیں ہیں۔

2 جولائی 2019

☆☆☆

کیا آپ جانتے ہیں کہ Self righteousness ایک نفسیاتی بیماری ہے جس میں تقریباً ہر شخص مبتلا ہوتا ہے لیکن باپ بیٹی اور اسٹیبلشمنٹ میں یہ بیماری لاعلاج ہے۔

2 جولائی 2019

☆☆☆

ہم اپنی نفسیات اور جبلی عادات کے زیر اثر لوگوں کو judge بھی کرتے ہیں اور معیار بھی بلیک اینڈ وائٹ بنا رکھا ہے۔ حالانکہ زندگی کے سفر میں ملنے والے لوگ ہماری طرح ہی

گرے (Gray) ہوتے ہیں۔ خوبیوں، خامیوں، کجیوں کا مجموعہ اضداد چنانچہ اپنی طرح لوگوں کو بھی space دیں اور ان کا بلا رنگ و نسل اور مذہب و ملت (اپنے عقائد اور روایات پر رہتے ہوئے) احترام کریں۔

10 جولائی 2019

☆☆☆

حکمت ربانی کے زیر اثر انسانی دماغ مقناطیس کی طرح کام کرتے ہیں۔ اگر آپ جلد باز اور آپ کا دماغ منفی سوچوں کی پناہ گاہ ہے تو آپ کو اپنے ارد گرد سے منفی رویوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ذہین پراگندہ رہے گا۔ چلتے ہوئے پاوں بیڈ سے ٹکرا جائے گا۔ برتن ہاتھ سے گر جائے گا۔ گاڑی کی چابی اندر رہ جائے گی۔ بچے آپ کو تنگ کریں گے۔ نند، ساس، بہو، باس اور آپ کے آس پاس کے لوگ بُرے نکل آئیں گے۔ آپکو لگے گا سب مصیبتیں آپکے لیے ہیں۔

اور۔۔۔

اگر آپ متحمل ہیں اور دماغ مثبت سوچوں کی آماج گاہ ہے تو آپ کو لوگ، موسم اور حالات یقیناً اچھے ملیں گے۔

17 جولائی 2019

☆☆☆

پاکستان شدید ترین قحط الرجال، اِخلاقی پستی اور مجموعی انحطاط پذیری کا شکار ہے۔ مذہبی اور سیاسی بلیدگی کا یہ عالم ہے کہ اختلاف رائے کا "پچ" بھی نہیں آتا۔

ہزار بار مذہبی اختلاف کیجیے!

زرداری، عمران اور نواز شریف سے اختلاف کیجیے!

مگر گھٹیا زبان، فتوی بازی، لغو اور جھوٹے الزمات، نجی زندگیوں پر رائے زنی اور تاریخ سے کھلواڑ اخلاقی پستی اور آپکی تربیت کا اظہار ہے۔

"زندگی اپنے محاسن پر گزرتی ہے دوسروں کے عیوب پر نہیں"

03 جون 2019

☆☆☆

ڈاکٹر کے کلینک پر لکھا ہوتا ہے کہ "مریض کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر سے سیکنڈ اوپینین بھی لے سکتا ہے اور علاج بھی کروا سکتا ہے"۔ کوئی استاد یا پروفیسر بھی منع نہیں کرتا کہ کسی دوسرے استاد سے رجوع نہیں کرنا یا تحقیق سے استفادہ حاصل نہیں کرنا۔

مگر

اہل جبہ ودستار یہ حق دین کے طالب علم کو نہیں دیتے۔ بلکہ قرآن وحدیث کو بھی فرقہ (اپنے) کی تشریح کے مطابق سمجھنے کا پابند کیا جاتا ہے۔ ورنہ-----

18 جون 2019

☆☆☆

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ بس خدا نہیں ہیں

جنہوں (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ) نے مواخات کے موقع پر علی مرتضی علیہ السلام کو اپنا بھائی بنا کر ان کی معاشی ذمہ داری خود اٹھائی اور اپنی معاشی ذمہ داری کسی پر نہیں ڈالی جب کہ ہجرت کے فورا بعد بھوک کا مداوا پیٹ پر پتھر باندھنا تھا۔ بنو ہاشم کے دیگر مہاجرین کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔

مبادا کسی کو خیال آئے کہ پس منظر میں اپنے خاندان کی کفالت مطلوب تھی۔

جنہوں (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ) نے زکوٰۃ کی فرضیت کے موقع پر بنو ہاشم کی ذیلی شاخوں پر نام بنام زکوٰۃ سے امداد لینا حرام کر دیا۔

مبادا یہ سمجھا جائے کہ اقرباء پروری کے لیے لوگوں پر ٹیکس لگا دیا گیا۔

جنہیں (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ) پتھروں سے مارنے والوں کو کچلنے کے لیے پہاڑ دے دیئے گئے اور انہوں نے ظالموں کی ہدایت کی دعا کر کے واپس کر دیئے۔

جنہیں (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ) تیرہ سال تک دنیا کی ہر اذیت دینے والوں پر اختیار مطلق حاصل ہو گیا انہوں (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ) نے کسی کو یاد بھی نہیں کرایا کہ وہ تم

تھے۔ اور یہ میں ہوں۔ ان کے بارے میں یہ سوچ کر میں تو کانپ جاتا ہوں کہ وہ اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام لے سکتے تھے۔

جب کہ عائشہ صدیقہ رضی عنہما کی گواہی کہتی ہے۔ آپ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

16 اپریل 2017

☆☆☆

کوتاہ اندیشی اور علمی انحطاط

دسمبر 1957 میں قائد اعظم کی تصویر والا 100 روپے کا نوٹ جاری کیا گیا تو مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی، میاں طفیل محمد اور کئی دوسرے علماؑ اور مذہبی رہنماؤں نے نوٹ پر تصویر کو سراسر غیر اسلامی قرار دیا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد یہ معاملہ اسی طرح ٹھنڈا پڑ گیا جس طرح گھڑی، لاؤڈ سپیکر، فوٹو وغیرہ آہستہ آہستہ جائز ہو گئے ہیں۔ بعد میں تو سِکوں پر بھی تصویریں آ گئیں۔

وہ علما جو تصویر کھنچواتے ہی نہیں تھے، آج ان کی جماعتوں کے کارکن اپنے لیڈروں اور ان کے جلسوں اور ریلیوں کی تصویریں چھپوانے کیلئے اخبار والوں کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔

30 دسمبر 2018

☆☆☆

رُدالِیاں

راجستھان کے علاقے میں نیچی ذات سے تعلق رکھنے والی عورتیں ایک مخصوص پیشہ اختیار کیے ہوے ہیں۔ وہ بڑی ذات کے مردوں کے مرنے پر پیسے لے کر روتی پیٹتی ہیں۔

انہیں ''رُدالیاں'' کہا جاتا ہے۔ ایسی عورتیں، جب کوئی اپنا مر جائے تو کم ہی روتی ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے یہ مفت کے رونے دھونے کا کیا فائدہ۔ ہماری مذہبی جماعتیں بھی ہمارے ملک کی ''رُدالِیاں'' ہیں۔ دنیا کے کسی کونے میں کسی کو خراش بھی آجائے منہ سے جھاگ اڑاتے، مبالغہ آمیز بین کرتے، روتے پیٹتے سڑکوں پر احتجاج شروع کر دیتے ہیں لیکن جب اپنے ملک میں اپنے لوگوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں ہزاروں بچے عورتیں اور جوان دہشت گردی کا شکار ہوتے ہیں تو مجال ہے انکی آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹپکے یا کوئی ایک احتجاجی ریلی دہشت گردی کے خلاف نکالیں۔ (بلکہ یہ نا تو کُھل کر طالبان کو دہشت گرد اور ملک دشمن کہتے ہیں، اک طرفہ تماشا طالبان کو شہید اور پاک آرمی کو دشت گرد کہنے سے باز نہیں آتے، اصل لفظ لکھنا نہیں چاہتا) ''رُدالیاں'' مفاد دیکھ کر روتی پیٹتی ہیں۔۔۔

14 ستمبر 2017

☆☆☆

اُلجھنے سے بچو

مرشد کہا کرتے تھے کہ سرِ بازار چلتے ہوئے کسی نے میرے ٹخنے پر ڈنڈے سے چوٹ لگائی درد اور غضب کی کیفیت میں پلٹ کر جو مارنے والے کو دیکھا، تو ایک نابینا اپنے ڈنڈے سے رستہ ٹٹول رہا تھا۔ غصے کی کیفیت جھٹ سے شفقت اور ترس میں تبدیل ہو گئی اور میں نے اس نابینا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو اس کی منزل تک پہنچا کر آیا۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ جب انسان کا نقطہ نظر تبدیل ہوتا ہے تو جذبات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں، ہمیں آج ایک دوسرے کے بارے میں نقطہ نظر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ جذبات خود ہی تبدیل ہو جائیں گے۔

وہ شخص زندگی میں کبھی ہار نہیں سکتا جو صبر کرنا سیکھ لے۔

صبر کرنا جتنا دشوار ہوتا ہے اس کا پھل اتنا ہی مزیدار ہوتا ہے۔

کبھی بھی کسی انسان کی طرف سے اپنی ناقدری پہ نہ کڑھنا۔

کیونکہ۔۔۔قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ وقت کرتا ہے۔

درجات کا تعین اوپر طے ہوتا ہے۔ انسانی رویوں میں اُلجھو گے تو ساری عمر اُلجھے رہو گے۔۔۔

بس "عیب اور غیب" کے جاننے والے سے اپنے معاملات درست کرلو، تمہارے سب معاملات سلجھ جائیں گے۔۔۔ ان شاء اللہ

29 مئی 2018

☆☆☆

مسلم معاشرے اور سیکولرازم

مشکل کی اس گھڑی میں کون ہے جو بھارت کے مظلوم مسلمانوں کا ہاتھ تھام سکتا ہے؟

ہر سمت سے ایک ہی آواز ہے: "سیکولرازم"۔

ہمیں تو بتایا گیا ہے کہ سیکولرازم 'لادینیت' ہے۔ مذہب کے خلاف اُٹھنے والا سب سے بڑا فتنہ۔ پھر وہ مسلمانوں کی مدد کو کیوں آئے گا؟ ان کی مذہبی شناخت کی حفاظت کیوں کرے گا؟ اب ان دو مقدمات میں سے ایک ہی درست ہو سکتا ہے:

"یا تو ہم نے سیکولرازم کو سمجھنے میں غلطی کی یا پھر تجزیے میں۔"

بھارت کے حالیہ سیاسی و معاشرتی حالات (کشمیر اور شہریت کے قانون کے تناظر میں) نے کم از سیکولرازم کو سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ اور معاشرے کے لیے اسکی افادیت پر بھی مہر ثبت کر دی ہے مگر کیا صرف بھارت کے لیے؟

"پر جلانے والا سوال ہے!"

فقیہان پاکستان کو اس مسئلے پر سنجیدہ علمی بحث کا آغاز کرنا چاہیے۔

پاکستانی معاشرے کو بھی ایک نئے عمرانی معاہدے کی از بس ضرورت ہے۔

28 دسمبر 2019

☆☆☆

میرے محسن

(ٹیچرز ڈے پر اپنے اساتذہ اور محسنوں کی یاد میں)

خاکسار مجموعہ اضداد ہے مگر خوش قسمت کہ ایسے نابغہ روزگار اہلِ علم و حکمت سے کسبِ فیض حاصل کیا جو صرف اپنے زمانے کے لیے ہی نہیں آنے والے ہر دور کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

یوں تو زانو اور پیشانی کچھ اور مشائخ کے ہاں بھی ٹیکی جیسے پروفیسر پرویز ہود بھائی، ممتاز مفتی، بابا یحییٰ، واصف علی واصف (وائے افسوس ایک مختصر سی ملاقات) اور پرویز ملک مگر :

1۔ پروفیسر احمد رفیق اختر (صوفی عصر معروف اسکالر جو ذات کے نوکیلے کونوں کو گول کرنے میں ثانی نہیں رکھتے)

2۔ بانو آپا (جو علم، حلم، محبت اور گیان کا مجموعہ ہیں)

3۔ بابا صاحبا (جو اگر اپنی ذات میں ایک یونیورسٹی ہیں مگر اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو میرے لیے وہ اس لیے بھی ہمیشہ قابل احترام رہیں گے کہ وہ بانو قدسیہ کے شوہر ہیں)

4۔ پروفیسر نثار احمد شیخ (سیالکوٹ کے معروف مذہبی اسکالر)

اور۔۔۔

5۔ پروفیسر اصغر سودائی (خالق ترانہ پاکستان، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ) کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کہ میری زندگی میں آئے اور ہمیشہ ان کی محبتوں سے فیض یاب رہا اور اب تک ہوں۔۔۔۔۔۔۔ باندازِ کورنش سلام اساتذہ

5 اکتوبر 2018

☆☆☆

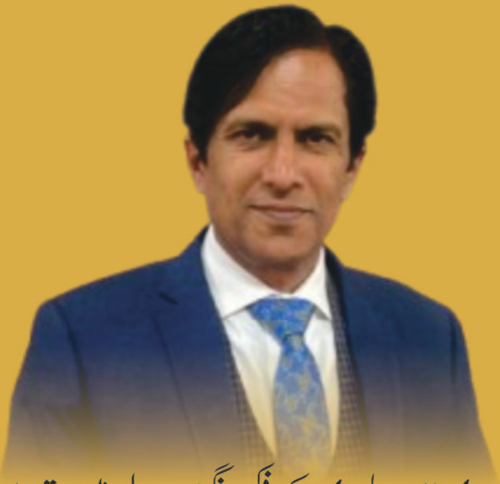

"اُفقِ خاور" چوہدری خاور سلہری کے فکر انگیز اور دل میں اتر جانے والے اخباری کالمز کا حسین انتخاب ہے۔ یہ تحریریں کبھی مذہب کی لطافتوں سے پردہ اٹھاتی ہیں، کبھی سیاست کے پیچیدہ موڑوں پر روشنی ڈالتی ہیں اور کبھی ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے پردے میں زندگی کی خامیوں کو نہایت شائستگی سے بے نقاب کرتی ہیں۔ کہیں اصلاحِ معاشرہ کا وقار ہے تو کہیں انسانی اقدار کی خوشبو۔ الغرض یہ کتاب ایک ایسے روشن ذہن کی جھلک پیش کرتی ہے جو ہر تحریر میں قاری کو نئی بصیرت عطا کرتا ہے۔

چوہدری خاور سلہری نہ صرف علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں بلکہ تدریس کے شعبے میں خدمت کے سبب انسانی نفسیات اور سماجی رویّوں کا نہایت قریب سے مشاہدہ رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں پُر سکون ٹھہراؤ، ملنساری، اور برداشت کا بے مثل حُسن ملتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانیت ایک وحدت ہے۔ اسی لیے وہ مذہبی، لسانی، نسلی اور سیاسی تعصبات سے بالاتر ہو کر ربّ کی نسبت سے انسانوں سے محبت کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔

اوّل اللہ نور اُپایا قدرت کے سب بندے
ایک نور سے سب جگ اُپجیا کون بھلے کو مندے

(بھگت کبیر جی، گورو گرنتھ صاحب انگ 1349)

یہ وصف ان کے کردار ہی میں نہیں، ان کے ہر کالم کی تہہ میں بھی جھلملا رہا ہوتا ہے۔
میرے نزدیک یہ خداداد صفت قدرت کا خاص کرم ہے اور چوہدری خاور سلہری نے اس نعمت کی آبیاری روحانی شخصیات کی قربت سے کی ہے۔

ربّ کریم سے میری دعا ہے کہ وہ اس مردِ درویش کو ہمیشہ اپنے فضل و کرم کے حصار میں محفوظ رکھے اور ان کے قلم کو اسی طرح روشنی بانٹنے کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

ڈاکٹر کلیان سنگھ کلیانؔ
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

ISBN: 978-969-7863-61-7
9 789697 863617

Sulaikh
bookmakers